وہاب اشرفی

ساہتیہ اکادمی کی قابل مطالعہ کتابیں

نئی کتابیں

کتاب		مصنف / مرتب / مترجم	قیمت
☆ روسی کلاسک: یوگینی اینگن	پوشکن	ترجمہ: خدیجہ عظیم	150روپے
☆ ملیالم ناول: دادا کا ہاتھی	وائکم محمد بشیر	ترجمہ: حیدر جعفری سید	40روپے
☆ ہندی کہانیاں: آزادی مبارک	کملیشور	ترجمہ: خورشید عالم	50روپے
☆ اندھیرے میں سلگتے حروف	سرجیت پاتر	ترجمہ: بلراج کومل	50روپے
☆ عصری ہندوستانی کہانیاں	(جلد ۴)	مرتب: مفتی تبسم ر بلراج کومل	200روپے
☆ میراجی	(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	شافع قدوائی	25روپے
☆ فرحت اللہ بیگ	(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	نامی انصاری	25روپے
☆ عرش ملسیانی	(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	ویریندر پرشاد سکسینہ	25روپے
☆ خلیل الرحمن اعظمی	(ہندوستانی ادب کے معمار سیریز)	مہتاب حیدر نقوی	25روپے
☆ بیسویں صدی میں اردو ادب		مرتب: گوپی چند نارنگ	250روپے
☆ لمبی بارش	(انتخاب کلام)	بلراج کومل	200روپے
☆ درد کی حد سے پرے	(انتخاب کلام اخترالایمان)	مرتب: بیدار بخت	150روپے
☆ آزادی کے بعد اردو فکشن	(سیمینار)	مرتب: ابوالکلام قاسمی	150روپے
☆ آزادی کے بعد اردو شاعری	(سیمینار)	مرتب: شہزاد انجم	300روپے
☆ اردو میں بچوں کا ادب	(انتھولوجی)	مرتب: مناظر عاشق ہرگانوی	200روپے

تصانیف مولانا آزاد

کتاب		مرتب	قیمت
☆ تذکرہ	(چوتھا ایڈیشن)		100روپے
☆ ترجمان القرآن	(چار جلدوں میں)		600روپے
☆ خطوط ابوالکلام آزاد		مرتب: مالک رام	100روپے
☆ غبار خاطر		مرتب: مالک رام	100روپے
☆ خطبات آزاد		مرتب: مالک رام	80روپے

فکشن

کتاب		مترجم / مرتب	قیمت
☆ انا کارینینا (دو جلدوں میں)	لیو تالستائے	مترجم: خدیجہ عظیم	500روپے
☆ زندگی نامہ (ہندی انعام یافتہ)	کرشنا سوبتی	مترجم: حیدر جعفری سید	225روپے
☆ سانپ اور رسی (انگریزی انعام یافتہ)	راجا راؤ	مترجم: بلراج کومل	180روپے
☆ راجندر سنگھ بیدی کے بہترین افسانے	(انگریزی)	مرتب: گوپی چند نارنگ	80روپے
☆ کرشن چندر کے بہترین افسانے	(انگریزی)	مرتب: گوپی چند نارنگ	80روپے
☆ بلونت سنگھ کے بہترین افسانے	(انگریزی ر اردو)	مرتب: گوپی چند نارنگ	150روپے
☆ پاکستانی کہانیاں		مرتب: انتظار حسین ر آصف فرخی	150روپے

رابطہ: ساہتیہ اکادمی، سیلز آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 110001، فیکس: 3364207

مباحثہ

پٹنہ

جلد ۲، ۳ دسمبر ۲۰۰۲ء، جنوری ۲۰۰۳ء شمارہ ۹

مدیر

وہاب اشرفی

فی شمارہ : ۳۰/روپے

سالانہ : ۱۵۰/روپے

بیرونی ممالک

فی شمارہ : دوڈالر

سالانہ : بارہ ڈالر

رابطہ

اشرفی ہاؤس، ہارون نگر، سیکٹر ۲، پٹنہ ۸۰۱۵۰۵

مالک و پبلشر نسیمہ اشرفی نے سن رائز پلاسٹک ورکس، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر "مباحثہ" ہارون نگر، سیکٹر ۲، پٹنہ ۵ سے شائع کیا

ترتیب

☆☆

اور یہ رسالہ

"مباحثہ" کا نواں شمارہ پیش کرتے ہوئے یہ احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اس بار رسالے کے محتویات میں خاصا تنوع ہے۔

جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری کے معاصرین میں ہیں۔ موصوف نے سردار کی شاعری کا ایک طائرانہ جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کی اشاعت کا جوازیہ ہے کہ جگن ناتھ آزاد کا مضمون ہے اور سردار جعفری پر ہے۔

ولی گجراتی کے مزار کی جس طرح بے حرمتی کی گئی ہے اس کا زخم بہتوں کے دلوں میں ابھی بھی گہرا ہے جس کے مندمل ہونے کی کوئی صورت بھی نہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اس مضمون کو قلمبند کر کے ایک اہم کام سرانجام دیا ہے۔ اسے دو ماہ پہلے ہی شائع ہونا چاہئے تھا لیکن تب پچھلا شمارہ چھپنے کی منزل میں تھا۔ ولی گجراتی کے احساس حسن کو شکیل الرحمٰن کے مخصوص موضوع جمالیات کے پس منظر میں بھی پڑھنا چاہئے۔ تاکہ اس کی مکمل تفہیم ممکن ہو سکے۔

سید محمد عقیل کا مضمون "فراق صاحب کو کیسے پڑھیں اور کیسے نہ پڑھیں" خاصا معلوماتی ہے۔ عمومی طور پر اس مضمون میں شاعر فراق کے دفاع کا پہلو نمایاں ہے لیکن سرسری طور پر نہیں۔ مجھے بھی احساس ہے کہ فراق اردو کے ایک محترم اور اہم شاعر تھے اور ان کی یہ پوزیشن کبھی کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ نئے ثقافتی مطالعات کی روشنی میں ان کی شاعری کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے خصوصاً "روپ" کی رباعیوں کا۔ سید محمد عقیل کا یہ مضمون فراق کی شاعری کے نئے ابعاد کی نشاندہی کرتا ہے۔

سلیم شہزاد نے انور خان کے افسانے کو ایک مخصوص انداز میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ

مطالعہ انور خان کی افسانہ نگاری کی تفہیم میں معاون ثابت ہوگا۔

شفق کا نیا ناول "بادل" چند ماہ پہلے شائع ہوا ہے۔ اس ناول کے سلسلے میں مختلف سلسلے کے تاثرات آتے رہے ہیں لیکن سرسری۔ حسین الحق اور اقبال حسن آزاد نے اپنے اپنے طور پر اس کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔ یہ دونوں تجزیے ایسے ہیں جنہیں غور سے پڑھنا چاہئے اس لئے کہ حسین الحق ایک معاصر ناول نگار ہیں ایسے میں ان کے تجزیے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اقبال حسن آزاد بھی ایک اچھے افسانہ نگار ہیں لہذا ان کی رائے بھی اہم تصور کی جاسکتی ہے۔

اظہار اثر بہت پرانے لکھنے والوں میں ایک ہیں۔ "نارو دا پٹیا" ایک نفسیاتی المیے کو پیش کرتا ہے۔ آج کے تناظر میں اس افسانے کی اہمیت محسوس کی جاسکتی ہے۔

حسین الحق اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ عمومی طور پر ان کی تخلیقات معیاری ہوتی ہیں۔ "زخمی زخمہ" ان کے ذہن کے ارتقائی سفر اور فنی گرفت کا بھی احساس دلاتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے تخلیقی جہات بہت وسیع ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان موضوعات کو بھی بخوبی فنی شکل دے سکتے ہیں جو عام طور سے زیر بحث نہیں آئے، اگر آئے بھی تو غیر تخلیقی طور پر۔ "فریج میں عورت" ایک نئے طرز کی کہانی ہے اور مشرف عالم ذوقی کے نئے فنی وژن کا ایک ثبوت بھی۔

حسن جمال کا افسانہ "سکون کی تلاش" آج کے انتشار کو سمیٹے ہوئے ہے۔ انسان کی بے کلی اور بے چینی منفی سہی لیکن کبھی کبھی یہ صورت واقعہ نمو پذیر ضرور ہوتی ہے۔ "سکون کی تلاش" ایسے ہی اضطراب کو نمایاں کررہا ہے۔

قاسم خورشید کے ڈرامہ "پورا ہندوستان" میں ایک نئے ہندوستان کی تلاش ہے جو ہر لحاظ سے تکمیل کا احساس دلائے۔ لیکن اس ڈرامے کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اسٹیج کے لوازمات پر بھی نظر رکھی گئی ہے اس طرح کہ یہ واقعتاً پیش کیا جاسکے۔ لہذا فکری اور فنی دونوں اعتبار سے اس کی قدر و قیمت محسوس کی جاسکتی ہے۔

"مہاماری" کی یہ قسط سیاسی بازیگری کو مزید واضح کررہی ہے۔ اب تک جتنی قسطیں شائع کی گئی ہیں وہ عمومی طور پر پسند کی گئی ہیں اور اکثر پڑھنے والے یہ احساس دلاتے ہیں کہ یہ ناول آج کے تناظر میں ہر لحاظ سے اہم ثابت ہوسکتا ہے۔ تو یہ قسط بھی دیکھئے اور شموئل احمد کو داد دیجئے۔

شکیب ایاز کی نعت اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی ہے، اس لحاظ سے توجہ کے لائق ہے۔

نظمیں مختلف نوعیت کی ہیں۔ رفعت سروش کی نظمیں ہم پہلے بھی شائع کر چکے ہیں۔ نظم نگاری کے سلسلے میں ان کا اپنا انداز ہے، جو اس نظم میں بھی واضح ہے۔ جاوید ہمایوں "غیر حقیقی شہر کا حقیقی منظر نامہ" پیش کر رہے ہیں اپنی نوعیت کی یہ ایک الگ نظم ہے اس لئے قابل توجہ ہے۔ انجم فاطمی اپنی شریک حیات کے واسطے سے ایک بہت بڑے المیے کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ موصوف کی شریک حیات ایک عرصہ سے فالج کا شکار ہو کر بستر مرگ پر ہیں۔ عارضے کا سلسلہ اتنا دراز ہے کہ جو بھی ان کے ساتھ جی رہا ہے اس کی زندگی بھی ٹریجک بن گئی ہے۔ اس نظم کی اشاعت کا جواز یہی ہے۔ شمیم فاروقی کی نظم سے طنز و مزاح کے مشہور شاعر واہی کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو رہی ہے۔ راشد انور راشد کی محبت سیریز نظموں کے تین رنگ ملاحظہ کیجئے۔ سلیم انصاری کی نظم "تلاش" بھی توجہ کی مستحق ہے۔

غزلوں کے بارے میں کیا کہوں، اس میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں پہلے بھی اپنی رائے واضح کر چکا ہوں۔ اب مجھے آپ کے خیالات اور آرا کا انتظار ہے۔

اس بار سلطان اختر کی رباعیاں مظہر امام کے نام ہیں۔ کچھ لوگوں کا احساس ہے کہ سلطان اختر غزل گوئی سے زیادہ شخصی قطعات یا رباعیات کی طرف مائل ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مختلف رسالوں میں ان کی غزلیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ ان رباعیوں کے ساتھ ان کی غزلیں بھی دیکھئے۔ ویسے مظہر امام کے باب کی رباعیاں مجھے پسند ہیں اس لئے کہ ان میں شعری اوصاف اتنے ہی نمایاں ہیں۔

"نئی شاعری، نئے تقاضے" کے تحت نعمان شوق کی بیس غزلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے اور پھر اس امر کا احساس دلانا چاہتا ہوں کہ نئے شعرا نے بہت کم وقت میں اپنی فکری اور فنی جہتوں کو وسیع کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنے دوسرے چند معاصرین کی طرح نعمان شوق موضوع کی تکرار نہیں کرتے ان کے جذبات واحساسات میں تنوع کی کیفیت بہت نمایاں ہے، پھر جو عصری تقاضے ہیں ان سے بھی نمٹنے کی سعی ملتی ہے۔ غزل کے ارتقائی سفر کو نگاہ میں رکھئے تو اندازہ ہوگا کہ اس صنف کی ایک طلسمی کیفیت ہے، جو ہر دور کے مزاج و میلان کو جذب کر لیتی ہے۔ شاعر اگر واقعتاً حساس ہے تو اپنی روایتوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اپنی بھی جگہ اور شناخت بنا لیتا ہے، نعمان شوق ایسی ہی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ کوثر مظہری نے "جواز و انتخاب" میں ان کا کلام شائع کیا ہے کلام کے ساتھ راشد انور راشد کا تجزیہ بھی ہے۔ اس باب میں چند سطریں ملاحظہ ہوں :-

نعمان کے یہاں عشق کا قدرے نکھرا ہوا تصور دیکھنے کو ملتا ہے۔ محبوب کے تعلق سے

ایک خاص طرح کی عقیدت اور احترام ان کے اشعار میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ سطحی لذتیت انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جنس غالب رجحان کی صورت میں اجاگر نہیں ہوتا۔ اور اگر کہیں اس کا عکس دیکھائی بھی دیتا ہے تو فنکارانہ برتاؤ کے باعث اس کا ذائقہ سلجھے ہوئے ذہن کے لئے بھی قابل قبول بن جاتا ہے۔''

اس بار ساہتیہ اکادمی کا انعام گلزار کو ملا ہے۔ موصوف شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ فلم کی بھی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ادارہ انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔

وہاب اشرفی

شکیب ایاز

نعت

انقلاب دنیا میں جو بھی آنے والا ہے
آپ ہی کی سیرت کا وہ نیا حوالہ ہے

کیسی تربیت دی ہے، کس طرح سے پالا ہے
کربلا کی وادی میں خون کا اجالا ہے

زندگی اسے کہئے، سروری اسے کہئے
ایک جو کی روٹی ہے، ایک ٹوٹا پیالہ ہے

بوریا نشینوں کو تخت و تاج کیا شئے ہے
اپنا سارے عالم میں ایک کملی والا ہے

روضہ رسالت پر کس نے حاضری دی ہے
نکہتوں کی بارش ہے، چاندنی کا ہالہ ہے

آپ ہی کے دامن کی خلوتوں میں خوشبو ہے
آپ ہی کے پرتو سے اپنے گھر اجالا ہے

ہر طرف تجسس ہے قدسیوں کے جھرمٹ میں
عرش سے پرے کوئی آج آنے والا ہے

اس سے بڑھ کے بھی کوئی نعت کی سند ہوگی
سورہ محمد بھی آپ کا رسالہ ہے

☆☆

جگن ناتھ آزاد

سردار جعفری کی شاعری پر ایک طائرانہ نظر

علی سردار جعفری "پتھر کی دیوار" کے حرف اول میں لکھتے ہیں :-

"آج پرانا نظام اور سماج مر رہا ہے اور نیا نظام اور سماج پیدا ہو رہا ہے۔ انسان اپنی پانچ چھ ہزار برس کی طویل تہذیبی تاریخ میں پہلی بار اپنے آپ کو وہم اور طبقات کی زنجیروں سے آزاد کر رہا ہے۔ پہلی بار انسان کے سر سے انسان کے پیدا کئے ہوئے ظلم واستبداد کا سایہ اٹھ رہا ہے اور پہلی بار اس "خاص" انسان کا ظہور ہو رہا ہے جو آقا نہیں ہے، غلام نہیں ہے، جاگیردار نہیں ہے، سرمایہ دار نہیں ہے، ظالم نہیں ہے، مظلوم نہیں ہے بلکہ صرف انسان ہے۔ آج پہلی بار اس محنت کش کا ظہور ہو رہا ہے جو جسمانی اور ذہنی محنت کے خانوں میں تقسیم نہیں ہے اور جو اپنی محنت کی قدر و قیمت جانتا ہے............. یہی وجہ ہے کہ میں اپنی شاعری کو نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی نہیں بنا سکا۔ میں اسے بیک وقت ستار کا نغمہ اور تلوار کی جھنکار بنانا چاہتا ہوں۔"

اس تحریر دل پذیر سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جعفری نے نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کو عزم و ہمت، جرات پسندی اور حوصلہ مندی سے کچھ متضاد کیفیت سمجھا ہے۔ اگر ہم اردو شاعری یا فارسی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کے لغوی معنی کے علاوہ اور معانی بھی ہیں۔ نالہ نیم شبی یا آہ سحر گاہی صرف رونے دھونے، ماتم کرنے یا قنوطیت سے پیدا شدہ کیفیت کا نام نہیں ہے۔

نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی میں انسان کے اندر رجائیت پیدا کرنے کی خاصی قوت موجود ہوتی ہے۔ نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی میں دعا کا عنصر بھی پوشیدہ ہے اور دعا ہمیشہ اچھے کاموں کے لئے اور اچھے عزائم کے لئے کی جاتی ہے۔ اگر اس کیفیت کا یہ عالم نہ بھی ہو تو بھی نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی ایک ایسی کیفیت ہے جو باکمال افراد اور پہنچے ہوئے انسانوں کو ملتی ہے۔ یہ تو ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جو غور اور فکر کرنے والے فنکاروں کو نصیب ہوتی ہے اور یہ نعمت غیر مترقبہ علی سردار جعفری کے حصے میں بھی آئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جعفری صاحب کو اس وقت تک یعنی ۱۹۵۰-۵۱ء تک اس کا علم یا احساس نہ ہوا ہو۔ بعض دفعہ شاعر کو خود اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ دینے والے نے اس کے دل و دماغ کو کیا کچھ دیا ہے۔ انقلاب پسندی کے ساتھ شاعر کا دل نرم و نازک جذبات سے اور شاعری کی روایات سے متاثر بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جعفری صاحب کی اسی کتاب میں جس کا اقتباس راقم التحریر نے اوپر کے سطور میں پیش کیا ہے، یہ اشعار نظر نہ آتے :

تمہارے اعجاز حسن کی میرے دل پہ لاکھوں عنایتیں ہیں
تمہاری ہی دین میرے ذوق نظر کی ساری لطافتیں ہیں
جواں ہے سورج، جبیں کی جسکی تمہارے ماتھے کی روشنی ہے
سحر حسیں ہے کہ اسکے رخ پر تمہارے رخ کی صباحتیں ہیں
میں جن بہاروں کی پرورش کر رہا ہوں زندان غم میں ہمدم
کسی کے گیسو و چشم رخسار و لب کی رنگیں حکایتیں ہیں
نہ جانے چھلکائے جام کتنے نہ جانے کتنے سبو اچھالے
مگر مری تشنگی کو اب بھی تری نظر سے شکایتیں ہیں

ایسا نہیں ہے کہ درانتی اور ہتھوڑے کا حسن یا اس کے کارنامے کسی فنکار کو متاثر کرتے ہوں اور خوبصورت چہرے متاثر نہ کریں، طلوع و غروب آفتاب کا منظر متاثر نہ کرے، ننھے بچے اور بالخصوص ان کی مسکراہٹ متاثر نہ کرے۔ یہ تمام پہلو علی سردار جعفری میں نمایاں ہیں اور محض وزن یا قافیہ پیمائی کی بنا پر نہیں بلکہ سچی اور متاثر کرنے والی کھری شاعری کی صورت میں۔ سردار جعفری کی شاعری متنوع موضوعات پر پھیلی ہوئی شاعری ہے۔ یہ صرف اشتراکیت یا اشتمالیت کے چوکھٹے میں محصور نہیں ہے۔ میں نے ان سے اکثر بار یہ کہا تھا کہ آپ کی شاعری کی حدود دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ اپنی کتاب کے

دیباچے میں اپنی شاعری کے جو حدود مقرر کر دیتے ہیں آپ کی شاعری ان حدود کو پار کر جاتی ہے۔ دینے والے نے آپ کو بظاہر نالہ نیم شبی اور آہ سحر گاہی کی دولت عطا نہیں کی لیکن اس کے نتائج یعنی درد و گداز کی کیفیت عطا کر دی ہے اور یہی درد و گداز کی کیفیت ہے جس نے آپ کی شاعری کو دلکشی اور دل آویزی عطا کی ہے۔ کہنے لگے جب میرا کوئی مجموعہ کلام میرے دیباچے یا حرف اول سمیت چھپ کے آجاتا ہے تب آپ یہ مشورہ دیتے ہیں۔ میں نے کہا مجھے قبل از وقت یہ معلوم بھی تو نہیں ہوتا کہ آپ اپنا مجموعہ کلام طباعت کے لئے مرتب کر رہے ہیں اور ابھی اس کا دیباچہ آپ نے لکھنا شروع نہیں کیا۔ یہ بات تو یہیں ختم ہو گئی لیکن میں نے کہا کہ مجھ ایسے قاری کے لئے یہ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آپ نے اقبال کا یہ شعر آدرش کے طور پر اپنے سامنے رکھا ہے:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دل جس سے پہاڑوں کے دہل جائیں وہ طوفاں

لیکن اس بات کا خیال نہیں کیا کہ اقبال نے "اسرار خودی" اور "پیام مشرق" کے علاوہ اور اپنی کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا۔ "رموز بے خودی" کا دیباچہ پانچ سات جملوں پر مشتمل ہے لیکن انہوں نے پہلے ایڈیشن کے بعد "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" دونوں کے دیباچے نئے ایڈیشنوں سے خارج کر دئے کیوں کہ دیباچوں کی حد بندی میں کلام کی وسعت اور گہرائی نہیں سما سکتی تھی ہاں "پیام مشرق" کا دیباچہ انہوں نے بر قرار رکھا۔ یہ آپ کو "پیام مشرق" کے ہر ایڈیشن میں ملے گا کیوں کہ اس میں مشرق اور مغرب کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔ فارسی شاعری سے یورپ کے، بلکہ خاص طور سے جرمنی کے بعض شعرا کیسے متاثر ہوئے اور سرمایہ اور محنت کی باہمی کشمکش یا باہمی رشتے پر ہر ایڈیشن کے قاری کے لئے روشنی ڈالنا ضروری تھا۔ آپ کی شاعری میں صرف کثرت موضوعات اور تنوع موضوعات ہی نہیں ہے اس میں اصناف کی اقسام بھی بہت ہیں۔ ان سب کا ذکر ایک دیباچے میں نہیں سما سکتا۔ جعفری صاحب کے ساتھ اس طرح کی بات چیت اکثر ہوتی رہتی تھی۔

ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ جعفری کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اسی "پتھر کی دیوار" کو لیجئے۔ اس میں پابند شاعری بھی ہے۔ غزلیں تو سب پابند شاعری کی مثالیں ہیں۔ اچھا ہوا کہ جعفری صاحب نے آزاد غزل کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہاں آزاد نظمیں اس مجموعہ کلام میں موجود ہیں اور ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ جعفری نے ایک مصرعے کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کیا ہے تو بحر کی نزاکت کو سامنے رکھ کر۔

ہمارے اکثر نئے شعرا جب آزاد نظم یعنی Free Verse کے ایک مکمل مصرعے کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تو دونوں اور تینوں ٹکڑے اپنے اپنے اوزان سے خارج ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی رہنمائی کیلئے سردار جعفری کی آزاد نظمیں دیکھ لیں۔ اب اس سلسلے میں "اودھ کی خاک حسیں" کا ایک بند دیکھئے :

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو
اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمیں کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجادیا ہے
شفق کی سرخی میں میری بہنوں کی مسکراہٹ گھلی ہوئی ہے

اب "نئی دنیا کو سلام" دیکھئے۔ یہ اردو میں اس انداز کی پہلی نظم ہے، تمثیلی نظم۔ سردار جعفری کے الفاظ میں :

اس کے کردار، کردار نہیں، علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم ساخاکہ ہے جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لئے بنایا ہے۔ واقعات کی بجائے واقعات

کے جذبات اور احساسات پیش کیے گئے ہیں۔"

اس طویل نظم کا کچھ حصہ پابند شاعری اور کچھ حصہ نظم آزاد پر مشتمل ہے اور یہ اسی حسن سے معمور ہے جس کا ذکر میں چند سطور پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ سردار کا مطالعہ ہر اعتبار سے قابل تعریف اور قابل رشک تھا۔ ادب، سیاست اور تاریخ میں جعفری کو گہری نظر حاصل تھی اور یہ تینوں موضوعات ان کے کلام میں موجود ہیں لیکن خالص شاعرانہ انداز میں۔ اگرچہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے اس مثنوی سے پہلے اردو میں سیاسی موضوع پر مثنوی نہیں کہی گئی ہے۔ یہ مثنوی ایک عدیم المثال تخلیق ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ اقبال کے "ساقی نامہ" کی سطح کی ہے لیکن اسے پڑھیں تو یہ اقبال کے ساقی نامے کی یاد دلا دیتی ہے اور اس کے ایک حصے کی جس کا عنوان "جمہور کا اعلان نامہ" ہے جعفری صاحب نے ابتدا بھی اقبال کے ساقی نامے سے کی ہے اور اقبال کے چار اشعار کے ساتھ مثنوی کے اشعار اس خوبصورتی کے ساتھ پیوست کیے ہیں کہ اقبال کے اشعار کے ساتھ شامل کرنے کے لئے شاید ان سے بہتر اشعار میسانہ ہو سکیں۔

"ترانہ جمہور" میں جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی شاعر کا کمال فن خاص طور سے نمایاں ہے۔ اس مجموعے کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں :

> "ان تمام نظموں میں سردار جعفری کا مخصوص رجائی طرز فکر مشعل کی طرح فروزاں نظر آتا ہے۔ وہ انسان، اس کی قوت عمل، عزائم اور حوصلوں پر بے پایاں اعتماد رکھتے ہیں۔"

یہ تو ہوئی جعفری کے فکر کی بات۔ اس مجموعہ کلام میں فن کی انتہائی بلندیوں تک جاتی ہوئی ایک نظم ایسی بھی ہے جس میں فکر، فکر نہیں رہا بلکہ جذبہ بن کر شعر میں ڈھل گیا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "سر طور —— آسمان پروازوں کے نام"۔ جب زمین سے اڑے ہوئے ہوا باز چاند پر اترے تو متعدد شعرا نے اس موضوع پر نظمیں کہیں۔ اس موضوع پر آل انڈیا ریڈیو پر مشاعرے بھی ہوئے لیکن جس بلندی پر سردار کی نظم "سر طور" پہنچی وہاں میری ناقص رائے میں کسی دوسرے شاعر کا کلام نہیں پہنچ سکا :

عقل چالاک نے دی ہے لا کر خبر
اک شبستاں ہے ایوان مہتاب میں

منتظر ہیں نگاران آتش بدن
جگمگاتی فضاؤں کے محراب میں
کتنے دلکش حسیں خواب بیدار ہیں
ماہ و مریخ کی چشم بے خواب میں
کھینچ پھر زلف معشوقہ نیلگوں
لے کے شعلے کو پھر دست بیتاب میں
مژدہ ہو یہ حسینان افلاک کو
بزم گیتی کا صاحب نظر آگیا
تہنیت حسن کو بے نقابی کی دو
دیدہ ور آ گیا پردہ در آگیا
آسماں سے گرا تھا جو کل ٹوٹ کر
وہ ستارہ بہ دوش قمر آ گیا
لے کے پیمانہ درد دل ہاتھ میں
مل کے چہرے پہ خون جگر آ گیا
بزم سیار گانً فلک سیر میں
اک ہنر مند سیارہ گر آ گیا

شوق کی حد مگر چاند تک تو نہیں
ہے ابھی رفعت آسماں اور بھی
ہے ثریا کے پیچھے ثریا رواں
کہکشاں سے پرے کہکشاں اور بھی
جھانکتی ہیں فضاؤں کے پیچاک سے
رنگ اور نور کی وادیاں اور بھی

اور بھی منزلیں اور بھی مشکلیں
ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی

آج دست جنوں پر ہے شمع خرد
دو جہاں جس کے شعلے سے معمور ہیں
لے کے آئیں پیام طلوع سحر
جتنے سورج خلاؤں میں مستور ہیں
کہہ دو برق تجلی سے ہو جلوہ گر
آج موسیٰ نہیں ہم سر طور ہیں

(گگارن کی پہلی پرواز سے متاثر ہو کر)

میں اپنے اس مقالے کو سیاسی رنگ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے قلم کو علی سردار جعفری کی شاعری پر مرکوز رکھا ہے لیکن ایک نظم کا ذکر جس کا عنوان ہے "اسٹالن کتھا" میں محض یہ بتانے کے لئے کرنا چاہتا ہوں کہ جعفری نے اردو شاعری کو کتنے خوبصورت رستوں اور منزلوں سے آشنا کیا ہے۔ چونکہ جعفری خواص کے ساتھ عوام کے بھی شاعر ہیں انہوں نے ایک نظم "اسٹالن کتھا" کے بیچ ایک ضمنی عنوان بھی دیا ہے اور وہ ہے "ڈھولک پر گانے کے لیے":

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا اسٹالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی
جس نے نربل نردھن جن کو مکتی مارگ دکھایا ہے
جس نے جنتا کی شکتی سے جنتا راج بنایا ہے
جس نے پونجی واد کے ہتھیارے ہاتھوں کو کاٹ دیا
جس کے کوہ نے انیائے کے بھاڑ سے منہ کو پاٹ دیا
اجڑے ہوئے دل پھر سے بسائے سینوں کو آباد کیا
مزدوروں کے ادھیایکتو سے دنیا کو شاد کیا

چمکا سوریہ کرن بن کر جس کے ماتھے کا اجیالا
دہک اٹھی جس کی درشٹی سے وشو کرانتی کی جوالا
جس کا خزانہ میری تری خوشیاں ہیں ایسا دھنوان
جس نے سمئے کی دھارا کا رخ موڑ دیا ایسا بلوان
لینن اس کا گرو اور ساتھی جنتا اس کی سینا ہے
وہ کہہ دے تو مرنا ہے اور وہ کہہ دے تو جینا ہے

سردار جعفری کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ اس نے اپنے کلام میں صرف فیض، سجاد ظہیر اور کرشن چندر کو خطاب کرتے ہوئے نظمیں نہیں کہیں بلکہ اپنے ہم خیال غیر ملکی شعرااور غیر ملکی احباب کو بھی اپنی شاعری کو موضوع بنایا۔ فرانس کا عظیم شاعر لوئی آواگوں، اسپین کا عظیم شاعر پابلو نرودا، فرانس کا مشہور عالم ایٹمی سائنس داں جولیو کیوری، امریکہ کے مشہور عالم حبشی موسیقار پال رابسن اور سویت یونین کا بزرگ ایلیا اہرن برگ یہ سب علی سردار جعفری کے حیطہ ء شاعری میں موجود ہیں۔

☆☆

شکیل الرحمٰن

ولی گجراتی کا احساس حسن

عجب شہر میں ہے پر نور یہ شہر
بلا شک جگ میں ہے مشہور یہ شہر
کہ ہے مشہور اس کا نام سورت
کہ جاوے جس کے دیکھے سے کدورت
بھری ہے سیرت و صورت سو صورت
ہر اک صورت ہے واں انمول صورت

ولی گجراتی گجرات پر عاشق تھے۔ سورت جو ایک شہر تھا 'عالم میں انتخاب' گجرات کے دل کی دھڑکن تھا۔ سورت کو نور اور روشنی سے بھرا شہر کہتے ہیں، اسے محبتوں کا گہوارہ کہتے ہیں، آب و ہوا میں تاثیر ایسی ہے کہ کدورت دور رہتی ہے۔ جاذب نظر صورت والے لوگ اپنی دلکش پیاری شخصیتوں سے متاثر کرتے ہیں، یہ شہر "سیرت و صورت" والوں سے بھرا پڑا ہے۔ شہر اسی لئے پر نور ہے کہ سورت میں ہر صورت انمول ہے، دل میں کدورت لئے کوئی اس چمکتے روشن شہر، محبتوں کے اس گہوارے میں قدم رکھتا ہے تو اس کی کدورت فوراً دور ہو جاتی ہے۔ قدم رکھتے ہی وہ محبت کے شیریں رس کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے۔

اس عجیب حیرت انگیز شہر کے عاشق کے مزار کو ہم نے ابھی ابھی صرف مسمار ہی نہیں کیا ہے، اس کے اوپر رات بھر میں ایک سڑک بھی بنا دی ہے اور اس مقام پر کہ جہاں گجرات کے اس دیوانے کا مزار تھا ایک بت بیٹھا دیا ہے!

ایسا ہوا ایک بار گجرات کے اس دیوانے کو گجرات سے باہر جانا پڑا، گجرات سے باہر قدم رکھتے ہی اس دیوانے کی دیوانگی اور بڑھ گئی، جدائی کے غم نے دبوچ لیا، فراق یار میں تڑپنے لگا، اس طرح کہ جس طرح کوئی سچا عاشق غم فراق میں تڑپتا ہے، اپنا حال اس طرح بتانے لگا :

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل
بیتاب ہے سینے میں آتش بہار دل

اور اپنے احساسات اور جذبات اور اپنی بے قراری کو اس طرح پیش کرنے لگا :

ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز
عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
افسوس ہے تمام کہ آخر کو دوستاں
اس میکدے سوں اٹھ کر چلا سدھ بسار دل
لیکن ہزار شکر ولی حق کے فیض سے
پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل

گجرات کے فراق میں عاشق کی جو کیفیت ہے اس کی چبھن کو محسوس کیا جا سکتا ہے "اس میکدے سوں اٹھ کر چلا سدھ بسار دل" میں جو درد ہے وہ ایک سچے عاشق کا درد ہے۔ آرزو یہ ہے کہ گجرات ایک بار پھر دیکھوں، ایک بار پھر وصل نصیب ہو جائے "پھر اس کے دیکھنے کا ہے امیدوار دل"

گجرات اور سورت کے ظاہری اور باطنی حسن کا عاشق بڑا حسن پسند ہے، اس کا احساس جمال بالیدہ ہے۔ جہاں مقام اور ماحول کے حسن پر فریفتہ ہے وہاں محبوب کے جمال کا ایسا عاشق ہے کہ محبوب کے جسم کے ہر پہلو کے حسن کو چوم چوم لیتا ہے۔ صرف آنکھوں سے نہیں بلکہ اپنے پورے وجود سے!

میر تقی میر سے قبل شرینگار رس (Sringara Ras) کے دو ممتاز شعرا میں ایک سلطان محمد قلی قطب شاہ ہیں اور دوسرے ولی گجراتی۔ محمد قلی قطب شاہ اور ولی گجراتی سے شرینگار رس کی شیرینی اور مٹھاس عطا کرتے رہنے کی جو روایت شروع ہوئی وہ میر کی جمالیات تک نقطہ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ شرینگار رس کا بہت بڑا شاعر ہے۔ ننھی، ساولی، پدمنی، مشتری، پیاری، گوری، لالن اور دوسری جانے کتنی مہ جبینوں کے ذکر میں قطب شاہ نے شرینگار کے بہت ہی رسیلے گھونٹ عطا کئے ہیں :

لوچن کی پتلیاں کے بت خانہ کوں کیا سجدہ
فقیر و نا تواں ہوں میں ، کروں اسی الحاح
(نجات)

کھولے جو کیس کنگھی کرنے کوں دے ظلمات
جو سر تھے بائے پھرا کھونپہ لکھ دے اصباح
حسن باغ میں کھلے پھول بہوت رنگ رنگ سوں
تمہاری باس تھی بھی پھول سے سکنا گستاخ
(سونگھنا)

چنچل تج نینا کی چمکار دیکھ
نت آسمان کیاں بجلیاں پائیں خط
(بجلیاں)

تج کیس رین اندکار کا کرتا مشک تر طمع
تج لب کے امرت نیر کا دھرتا اسکندر طمع
(آب حیات)

(سلطان قلی قطب شاہ)

کلیات قلی قطب شاہ میں شرینگار رس لئے سینکڑوں اشعار موجود ہیں۔ شاعر کا رومانی ذہن ہی شرینگار رس پیدا کر سکتا ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ اور ولی دکنی دونوں ایک زرخیز رومانی ذہن رکھتے ہیں۔ اسی ذہن نے حسن کے احساس میں شدت پیدا کی ہے۔ ولی گجراتی کا تخیل صاف شفاف ہے لہذا کلام میں بھی بڑی سادگی ہے۔ عام فارسی اور ہندوی الفاظ سے اشعار میں کشش پیدا ہو گئی ہے۔ سادہ تجربوں اور شفاف تخیل اور عام فہم لفظوں، ترکیبوں اور استعاروں سے بڑا خوشگوار جمالیاتی تاثر پیدا ہوتا ہے، تجربوں اور لفظوں کے آہنگ سے ایک لطیف میلوڈی پیدا ہوتی ہے۔ شرینگار کے تجربے ہرش بھو (Harsh Bhava) پیدا کر دیتے ہیں یعنی جمالیاتی انبساط حاصل ہونے لگتا ہے۔ حسن محبوب کو اس طرح پیش کرتے ہیں :

کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب
تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

یکہ پلک دو جے پلک سوں ٹک نیں ہوئی ہے آشنا

جب سوں تیرے حسن نے نشتی ہے حیرانی مجھے

محبوب کی شوخی پر بھی فریفتہ ہیں :

حیرت سوں گئی پری سوں پر مارنے کی طاقت

دیکھی جو یک نظر بھر تجھ ناز و چھب کی شوخی

محبوب کے قد اور اس کی رفتار کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :

خوش قداں سب اس انگے حیراں ہیں

ہے لٹک میں جیوں کبک رفتار خاص

مت پست قطر تاں سوں مل اے سرو نازنیں

تجھ قدر کا نام جگ میں ہے نام خدا بلند

قد، زلف اور دہن کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔ الف لام میم سے کیا لطف پیدا ہو گیا ہے :

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن پیو کا جب ستی

کیتا ہوں ورد تب سوں الف لام میم کا

سادگی اور پرکاری دونوں شاعر کے احساس جمال کی دین ہیں۔ مثلاً قد کا ذکر اس طرح بھی ہوتا ہے :

دیکھ کر اس کوں ہوئے سرو و صنوبر پابند

اس قد قد میں ترے جلوہ رعنائی ہے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن

باعث خمیازہ آغوش ہے

قد ترا رشک سرو رعنا ہے

معنی نازکی سراپا ہے

محبوب کے آتے ہی ہر ذرہ رقص میں آجاتا ہے :

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے

جلوہ گر آفتاب سیما ہے

اس کا سبب یہ ہے کہ محبوب انتہائی حسین متحرک پیکر ہے، چہرہ یار و قامت زیبا گل رنگیں و سرو رعنا ہے اور

معنی حسن و معنی خوباں

صورت یاسوں ہویدا ہے

کمر نازک و دہان صنم

فکر باریک ہے معمہ ہے

'دہن' جمال کی معنی خیز علامت ہے :

تجھ دہن کو دیکھ بولا ولی

یہ کلی ہے گلشن امید کی

'لب' کی شیرینی اپنی مثال آپ ہے :

ہے ترے لب سوں اے شکر گفتار

بات کہنا نبات سوں شیریں

میٹھی تری جو بات اہے نت نبات ریز

گویا رکھے ہیں لب میں ترے مایہ نبات !

ظلمات سوں نکل کے جہاں میں عیاں اچھے

گر حکم لیوے لب سوں ترے چشمہ حیات

گل سوں زبان حال سوں کہتا ہے یہ بچن

غنچے کوں تجھ دہن سوں سدا انفعال ہے

ترے شکر لب کی کیا ثنا کہوں کہ لعل جگ میں جو ہے معزز

ترے لباں کی یہ دیکھ سرخی سوں اس نے رنگ و دمک لیا

اردو کی شاعری میں غالب سے بہت پہلے ولی گجراتی نے اپنے بعض اشعار میں ایسے حسی تجربوں کا

اظہار کیا تھا :

ترے شکر لب کی کیا ثنا کہوں کہ لعل جگ میں جو ہے معزز

ترے لبوں کی یہ دیکھ سرخی سوں اس نے رنگ و دمک لیا ہے

محبوب کے حسن و جمال کا اثر عناصر زندگی پر ہوتا ہے وہ محبوب کے رنگ کو اپنا رنگ بنا لیتے ہیں، لعل کی سرخی محبوب کے لبوں کی سرخی جیسی ہے، لعل نے رنگ و دمک محبوب کے لبوں سے لیا ہے۔ (غالب نے تحرک اور رقص کو شامل کر کے ایسے حسی تجربوں کو حد درجہ پرکشش بنا دیا ہے۔) ولی کہتے ہیں :

سرخ ہے شعلہ تری اگن کا جو جا فلک پر جھلک لیا ہے

نمک نے اپنے نمک کوں کھو کر ترے نمک سوں نمک لیا ہے

یہ در سوں ترے جو نور چمکا سوں اس سوں تارے ہوے منور

یو چاند تجھ حسن کو جو نکلا فلک نے تجھ سوں اچک لیا ہے

ترے درس کا یہ نور انور جدھا سوں روشن ہوا ہے جگ میں

ندھاں سوں تجلی نے اس چمک سوں اپس چمک پر چمک لیا ہے

پڑیا ہے لعل میں پرتو سجن تجھ لب کی لالی کا

بیاں ہے یہ سوں روشن تر تری وجہ کمال کا

محبوب کے جمال کے اثر کو اس طرح بھی محسوس کیا ہے :

مت آئینے کوں دکھلا اپنا جمال روشن

تجھ لکھ کا آب دیکھ آئینہ آب ہو جائے گا

غور فرمایئے جمال محبوب کا ردعمل آئینے پر کیا ہو گا!

چمن میں محبوب کی آمد سے سرو صنوبر نہال ہو جائیں گے، گل بدن کو دیکھ کر بلبل میں رنگین خیالی پیدا ہو جائے گی :

اس قد سوں جس چمن میں وہ نو نہال ہو گا

کیا سرو کیا صنوبر ہر یک نہال ہو گا

معنی کے جو چمن میں ہے بلبل معنی

تجھ گل بدن کے دیکھے رنگیں خیال ہو گا

جمال محبوب کا یہ اثر ہوتا ہے :

تری آنکھیاں کی گردش نے کیا شاعر کو سر گرداں
تری زلفاں کے حلقے نے کیا گرداب کوں چکرت

البتہ گل پیادہ ہو دوڑیں رکاب میں
اس نو بہار حسن کی دیکھیں جو شان آج

اس بنیادی حسی تجربے کے پیش نظر ولی نے ایک اور جمالیاتی پہلو پیدا کیا ہے، کہتے ہیں جب سے محبوب نے مجھے قتل کیا ہے لالہ و گل مجھ سے رنگ اور بوئے درد لئے جا رہے ہیں، بہت عمدہ شعر ہے یہ بھی :

لالہ و گل مجھ سوں لے جاتے ہیں رنگ و بوئے درد
گل رخاں کے عشق نے جب سوں کیا ہے خوں مجھے

ولی گجراتی کے جمالیاتی تجربوں میں محبوب کے 'قد'، 'مکھ'، 'زلف'، 'ابرو'، 'بھوں'، 'پلک'، 'انکھیاں'، 'نین'، 'غمزہ'، 'لطافت سخن'، 'مشک زلف' وغیرہ کی یقیناً بہت اہمیت ہے مثلاً :

تری انکھیاں کی ہے تعریف ہر ہر بیت میں میری
غزالاں صید ہوا کریں جہاں میری غزل جاوے

ولی ہے اسقدر صافی صنم کے صاف چہرے پر
کہ اسکے وصف لکھنے میں قلم کا پگ پھسل جاوے

اس زلف کے طلسم کوں دیکھا ہوں جب ستی
پایا ہوں تب سوں رشتہ جادوگری کے تئیں

لکھا پلک کے قلم سوں میں اے کماں ابرو
جگر کے خون سوں تجھ کی سیہ تابی

اس کے مکھ کی شعاع کوں کرتا ہے
ہر صبح آفتاب استقبال

بے منت شراب ہوں سر شار انبساط
تجھ نین کا خیال مجھے جام جم ہو

یاد کرتا ہے سدا مصرع زنجیر جنوں
دل بیتاب کہ تجھ زلف کا سودائی ہے
جس طرف سے صنم کی نگاہ نین گئی
سرے کا منہ سیاہ کیا ان نے جگ نین
کیا تری زلف کیا ترے ابرو
ہر طرف سوں مجھے کشاکش ہے
سفر عشق کیوں نہ ہو مشکل
غمزہ چشم یار رہ زن ہے
درکار نئیں ہے مسجد سجدے کوں عاشقاں کے
محراب تجھ بھنواں کی اے قبلہ گاہ بس ہے
تقدیر تیرے قد کی مصور نہ لکھ سکے
ہرگز کسی نے ناز کی صورت نئیں لکھی

—— لیکن نگاہوں کا سب سے عزیز مرکز محبوب کے ہونٹوں کا جلوہ ہے جو انتہائی لذیذ رسوں سے بھرا ہوا ہے۔ شاعر کے احساس جمال کی تیر پہچان ان اشعار سے ہوتی ہے کہ جن میں لب اور اس کی لذت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً:

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا
دم عیسی ہے نام تجھ لب کا
تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سے کہوں گا
حسن کے خضر نے کیا لب ریز
آب حیواں سوں جام تجھ لب کا
ترے لب پر جو خط عنبریں ہے
خط یاقوت سوں نقش نگیں ہے

میٹھی تری جو بأت اہے نت بنات ریز

گویا رکھے ہیں لب میں ترے مایہ نبات

ظلمات سوں نکل کے جہاں میں عیاں اچھے

گر حکم لیوے لب سوں ترے چشمہ حیات

ہے ترے لب سوں اے شکر گفتار

بات کہنا بنات سوں شیریں

محبوب کا جسم اور جسم کے دلفریب، دلکش اور لذت آمیز اشارے شاعر کا بنیادی موضوعات ہیں ۔ پورے کلام کی جمالیات کی چھاؤں میں آجایئے تو لذت آمیز سکون ملے گا۔ ہندوستانی جمالیات میں ''ہرش بھو'' کا ذکر ملتا ہے یعنی لذت آمیز انبساط (Feeling of joy) ولی گجراتی کی شاعری میں ''ہرش بھو'' کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ ان سے ان کے احساس حسن یا یہ کہئے کہ ان کی پوری جمالیات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جانے کتنے محبوبوں کو اجنتا کی تصویروں کی طرح پرکشش بنا کر انہیں متحرک کیا ہے۔ ولی کا معاملہ اور ہے۔ کلام ولی میں ایک ہی محبوب کا پیکر ہے جس کے حسن و جمال کو جانے کتنے زاویوں سے دیکھا گیا ہے۔ ہر ایسی جمالیاتی تشریح جو محبوب کے حسن سے تعلق رکھتی ہے جمالیاتی بصیرت اور انبساط عطا کرتی ہے۔ ولی ایک مصور شاعر ہیں جو خوبصورت ترین پیکر کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور جمال محبوب کے پیش نظر رنگوں کا انتخاب کرتے ہیں، خود کہتے ہیں :

بیاں اس کی نزاکت ہور لطافت کا لکھوں تا کے

سراپا محشر خوبی نین ناز و ادا دستا

مصور شاعر محبوب کے حسن کو دیکھ حیرت زدہ رہ جاتا ہے :

یک پلک دوجے پلک سوں نئیں ہوئی ہے آشنا

جب سوں تیرے حسن نے بخشی ہے حیرانی مجھے

محبوب پری پیکر ہے، شوخ ہے (دیکھی جو یک نظر بھر تجھ ناز و چھب کی شوخی) قد آور ہے، زلف جمنا کی موج ہے (زلف تیری ہے موج جمنا کی) عجیب خوشبو ہے زلف میں، چہرہ دل ربا ہے، (ترا مکھ ہے چراغ دلربائی) نین ؟

جس طرف صنم کی نگاہ نین گئی
سرمے کا منہ سیاہ کیا ان نے جگ نین

ابرو ــــــ ؟

کماں ابرو پہ جیو قرباں ہوا ہے
دل اس کے تیر کا پیکاں ہوا ہے

اور بھوئیں، پلک ؟

بھواں ، تیغ و پلک ، خنجر ، نگہ تیر
جو کس کے قتل کا ساماں ہوا ہے

دہن ؟

اے صنم تیرے دہن کے شوق سوں
ہر کلی میں نغمہ ناقوس ہے

اور آب حیات لئے ہوئے رس بھرے ہونٹ ؟

ولی کو محبوب کے پیکر سے لذت آمیز انبساط حاصل ہوتا ہے اور اس طرح گزارش کرنے لگتے ہیں :

یک بات ہے ولی کی سنو کان دھر سجن
میری انکھاں کے باغ میں دائم رہا کرو

اس گزارش کے تعلق سے یہ اشعار بھی توجہ طلب بن جاتے ہیں :

اے رشک ماہ تاب تو دل کے صحن میں آ
فرصت نہیں ہے دن کو اگر تو رین میں آ
اے گل عذار غنچہ دہن ٹک چمن میں آ
گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ
کب لگ ایس کے غنچہ مکھ کو رکھے گا بند
اے نو بہار باغ محبت سخن میں آ
تا گل کے رو سے رنگ اڑے اوس کی نمن
اے آفتاب حسن تو یک ٹک چمن میں آ

ولی گجراتی ہندوی اور عجمی شعری روایات کی خوبصورت وحدت کے شاعر ہیں۔ عجمی روایت سے ترکیبوں کی چمک دمک اور معنی خیزی حاصل کی ہے مثلاً لب لعلین، رنگ یاقوت، گوشہ داماں، موج بے تابی دل، چمن زار حیات، موج چشمہ آب بقا، پرتو حسن، گل باغ وفا، خط ریحان، چاہ زنخداں، زلف پریشاں، بہار نیم خوابی، موج چشم، عقیق جگری، شعلہ آواز، پنجہ خورشید، جامہ تنگ وغیرہ۔ ہندوی روایات کو تو بڑی شدت سے جذب کیا ہے۔ مثلاً تان (لے) ٹھٹ (ہجوم) انجھو (آنسو) اندکار (تاریکی) ٹھار (جگہ) نین، پکھڑی (پنکھڑی) بھھاس (ایک راگ کا نام ہے) پھھوتی، تکڑی (ترازو) پھل، بولیا (بولا) پرت (پیار) پرم (پریم) بھجنگ (ناگ) درس (درشن) سنگرام (جنگ) سور (سورج) سال (کانٹا) چکارا (ہرن) دھات، مٹ (مٹھ) نیر (آنسو) وغیرہ، ہندوی روایت کے سینکڑوں الفاظ موجود ہیں۔ فارسی ترکیبوں اور ہندوی لفظوں کی آمیزش سے ولی گجراتی نے حسن کے اثرات وکیفیات کو محور بنایا ہے۔ عشق اور محبوب کے تعلق سے جمالیاتی آسودگی بخشنے کی خوب کوشش کی ہے۔ شاعر کی جمال پسندی کا مطالعہ کرتے ہوئے ہندوی اور عجمی شعری روایات کے حسن اور وحدت حسن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان سے عشقیہ لب و لہجے کی کشش میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ جب ولی کا دیوان ۱۷۲۰ء میں دلی پہنچا تو دلی کے شعرا استعاروں اور تشبیہوں کے حسن کی سادگی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ دیوان میں محبوب کے حسن و جمال اور عاشق کی محبت کے ساتھ صوفیانہ خیالات بھی ان ہی استعاروں اور تشبیہوں کے ذریعہ سامنے آئے تھے۔ ولی کے کلام میں عورت بڑی شدت سے محسوس ہوئی اور ساتھ ہی صوفیانہ خیالات کی روشنی بھی حاصل ہوئی۔ جمالیاتی تجربوں اور مشاہدوں کو لئے یہ کارنامہ تو سامنے آیا ہی تھا، فارسی اور ہندوی لفظوں اور ترکیبوں کے جلوے بھی انتہائی پرکشش تھے، دو زندہ متحرک روایات کی آمیزش سے ایک جہت دار جمالیاتی وحدت پیدا ہو گئی تھی، تجربہ لفظوں اور ترکیبوں میں ایسا جذب تھا کہ لفظوں اور ترکیبوں کی چمک دمک حد درجہ پرکشش بن گئی، ہندوی اور فارسی لفظوں کو ساتھ ساتھ رکھ کر بھی ولی نے شعری تجربوں کو روشن کیا ہے اور اچھی میلوڈی پیدا کی ہے۔ اس دیوان کو پا کر شعرا بے اختیار اس کی جانب لپکے، تجربوں کے حسن اور حسن اسلوب دونوں نے انہیں کھینچا۔ آبرو، ناجی، مضمون، حاتم، یکرنگ اور فائز وغیرہ نے دیوان ولی کو آنکھوں سے لگایا اس طرح سراج اورنگ آبادی، داؤد اورنگ آبادی، ناجی، شاہ تراب، اشرف گجراتی، رضی، ثنااللہ ثنا، سب نے اس دیوان کی جمالیات کے اثرات قبول کئے۔ ولی گجراتی رفتہ رفتہ ایک دبستان بن گئے، انکے خیالات اور طرز بیان کو قبول کرنے کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ ولی ایک جمالیاتی مزاج بن گئے، ایک جمالیاتی معیار بن گئے۔

ولی کی تشبیہوں اور استعاروں میں جو انوکھا پن ملا، باطنی کیفیات کی جو دلکشی ملی، ہندوی روایات کا جو آہنگ ملا، عجمی شاعری کی جو لطافت اور مٹھاس ملی، تصوف کی جو سر مستی ملی، گوشت پوست کا جو محبوب ملا، بصیرت عطا کرنے والے جو علائم ملے ان سے شعر احد درجہ متاثر ہوئے، انہوں نے گجری چوڑا پیشانی کا ٹیکا ہنسلی، چندن، طنبورہ تال، منڈل جھانجھ وغیرہ کبھی سنا نہیں تھا، لٹکا (غمزہ) کاسی (کاشی) کبل (مشکل) ہمن ہمنا، طاس (کٹورا) کھبالے (گھونگھر والے) علی ہند (ہتھ پھول) وغیرہ کب سنا تھا۔ ولی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے فارسی محاوروں کے ترجمے کئے اور ان سے اردو زبان میں نئی تازگی پیدا کی۔ مثلاً دامن گرفتن، آب کردن، تنگ شدن، دم زدن وغیرہ کے ترجمے اردو غزل کے دامن میں نئے پھولوں کی طرح گرے، ولی نے جس طرح ہندوی اسالیب اور لفظیات کا مطالعہ گہرے طور پر کیا تھا اسی طرح انہوں نے فارسی زبان کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ سعد اللہ گلشن، امیر خسرو اور نظیری کو تو خوب پڑھا تھا۔ ان کے رومانی ذہن کا مطالعہ ان ترکیبوں کے پیش نظر بھی کیا جا سکتا ہے جو اردو، فارسی، عربی اور ہندوی روایات کی وحدت کی دین ہیں۔ مثلاً خوش نین، نرگس نمن، خنجر مژگاں کی باڑ، تیغ وپلک، زلف وبال، ارمان بھری چنچل وغیرہ۔ کلام ولی کی میلوڈی میں ایسے لفظوں، ترکیبوں اور استعاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ ان سے ولی کے شعری تجربوں کو لطیف آہنگ ملا ہے۔ شاعر کے آزاد ذہن اور جمالیاتی وژن نے جہاں سے چاہا لطافت، شیرینی اور صوتی زیر و بم کے لئے الفاظ منتخب کر لئے۔ ولی کی شاعری میں اگن، پیو، پریتم اور زلف عنبریں، موج تبسم، آتشیں نشتر، باغ محبت کی آمیزش اپنی مثال آپ ہے۔

ولی گجراتی کے احساس حسن کے پیش نظر چند اشعار سن لیجئے:

عجب کو لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

وہ صنم جب سوں بسا دیدہ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

یاد آتا ہے مجھے جب وہ گل باغ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشہ دامان میں آ

آج تیرے بھنواں نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

تجھ لب کی صفت لعلؔ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

اے قبلہ رو ہمیشہ محراب میں بھنواں کی
کرتی ہیں تیری پلکاں مل کر نماز گویا

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

تجھ زلف کے بے تاب کوں مشک ختن سوں کیا غرض
تجھ لعل کے مشتاق کوں کان یمن سوں کیا غرض

ہر جھلک دیتی ہے تجھ رخسار کی
آرسی کوں درس حیرانی ہنوز

گل کر پڑیں گے گل نمن بے شک گلستاں کے بغیر
تجھ گل بدن کے حسن کوں گر ٹک کریں گل فام فام

خوب رو خوب کلام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں

کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کوں
صبح عاشق کوں شام کرتے ہیں

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیال یار بے پروا
کہ جیوں انکھیاں میں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

ولی گجراتی 'ہرش بھاوَ' (feeling of joy) کے ایک حساس کلاسیکی شاعر ہیں جن کا احساس حسن اردو شاعری کی جمالیاتی کی تاریخ میں حرف اول کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆

سید محمد عقیل

فراق صاحب کو کیسے پڑھیں اور کیسے نہ پڑھیں

فراق صاحب ایک طلسمی شخصیت کے مالک رہے تھے۔ ان میں دلچسپی رکھنے والے ہمیشہ انہیں اور ان کی شخصیت کو عجیب و غریب ڈھنگ سے دیکھتے اور ان کی شاعری کا بھی عجیب عجیب طرح سے مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے۔ پھر ایسے بھی دعوے کرنے والے ملتے ہیں کہ فراق کو جتنا انہوں نے دیکھا اور سمجھا ہے، اتنا نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ سمجھا ہے۔ ان دعووں اور صورتوں کے بھی مختلف ادوار رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا دور ۳۶۔۱۹۳۵ سے ۴۲۔۱۹۴۱ کا دور ہے جب فراق نظم اور نثر دونوں میں الکھ چلا رہے تھے۔ نثر پر ان کے متفرق مضامین "نگار" اور اردو کے دوسرے رسالوں میں چھپ رہے تھے جو بعد کو "اندازے"، "حاشیے" اور "اردو غزل گوئی" کی شکل میں شائع ہوئے۔ نیاز فتح پوری، فراق کے بے حد معترف تھے۔ انہیں سب سے پہلے فراق صاحب پر پہلا مضمون "یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر" کے نام سے غالباً ۳۷۔۱۹۳۶ میں اپنے رسالے "نگار" میں لکھا۔ اور ان کی شاعری میں ایسے ایسے نکتے نکالے جو اس وقت کسی نے سوچا بھی نہ تھا۔ نیاز صاحب کا اس وقت طوطی بول رہا تھا۔ جو چیز ان کے رسالے "نگار" میں چھپ جاتی وہ ہمیشہ قسم اول کی چیز سمجھی جاتی۔ پھر جس شاعر یا ادیب کی تعریف، نیاز صاحب کر دیتے گویا اس کو مکمل ادیب اور شاعر کی سند مل جاتی۔ نیاز صاحب نے مختلف زاویوں سے فراق صاحب کی شاعری کا جائزہ لیا تھا۔ اس میں قدیم تنقیدی اصولوں اور اس وقت کی تنقید کے کچھ جدید نقد کے رویوں کو ملا کر فراق صاحب کی شاعری کی ایک تصویر پیش کی تھی۔ سب اردو والے جو نیاز صاحب کے طرز تنقید سے واقف تھے وہ بھی نیاز صاحب کی اس پسندیدگی سے متعجب ہوئے۔ پھر یہ کہ یہ نوجوان ہندو شاعر کیا؟ مگر کچھ لوگوں نے بھانپ لیا۔ اردو شاعری کی دنیا میں اسی وقت جوش کی شاعری کا غلغلہ ہوا اور اہل لکھنو میں سے ایک حلقے نے جوش کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیاز صاحب کو یہ رویہ پسند نہ آیا کہ بغیر "نگار" اور نیاز صاحب کے جوش کو کیسے شہرت مل رہی

ہے۔ چنانچہ بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے فراق کا انتخاب کیا کہ فراق میں انہیں ایسا جوہر قابل نظر آیا، جو جوش کے مقابل ہو سکتا ہے۔ یہ باتیں اس وقت بہت عام تھیں۔ راقم نے یہ باتیں احتشام حسین اور لکھنو ہی کے ایک ادیب مرزا جعفر حسین سے سنی تھیں۔ ایسے لوگ بھی ملے جو یہ سمجھتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ فراق صاحب پر اگر نیاز نے یہ مضمون نہ لکھا ہوتا تو فراق صاحب پر کوئی نظر بھی نہ ڈالتا کہ فراق صاحب نہ تو اردو کے عروض و قوافی کے ٹریڈیشن سے واقف تھے اور نہ انہیں اردو کی ثقہ تہذیب کا اتہ پتہ تھا۔ فراق صاحب نے اسی وقت کہیں یہ لکھ دیا کہ نوح ناروی الفاظ کے ڈنڈے لئے ہوئے اردو شاعری کو بھیڑ میں کھدیڑے پھرتے ہیں (صحیح جملے اس وقت یاد نہیں لیکن کچھ اسی طرح کی باتیں تھیں)لوگوں نے ایسی بات کو اردو کے ایک استاد کے لئے سوء ادب سمجھا اور فراق صاحب کو اردو کی ادبی تہذیب سے ناواقف بھی اور پھر فراق کو ایک متعصب عینک سے دیکھنے لگے۔ اگرچہ نیاز صاحب نے فراق کو یوں متعارف کرایا تھا۔

(۱)"ان کا (فراق کا) میلان وہی ہے جو مصحفی کا تھا کہ جس رنگ کو لیا اپنا لیا اور ذہین و بے قرار طبیعت رکھنے والے شاعروں کو اکثر و بیشتر اس نیرنگی میں مبتلا پایا گیا ہے...... شاعری کے لئے الفاظ کا انتخاب اور طرز ادا دو نہایت ضروری چیزیں ہیں لیکن اس کے ساتھ خیال بھی پاکیزہ ہوں تو کیا کہنا...... پھر چونکہ فراق کے کلام میں، ان تینوں کا اجتماع ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے "قدر اول" کا مرتبہ نہ دیا جائے۔"

(۲) فراق کی شاعری میں مومن کا رنگ غالب ہے...... مومن جو کچھ کہتا ہے بہت ڈوب کر کہتا ہے...... اس کی شاعری اسی دنیا کی شاعری ہے...... اس کی فارسی ترکیبوں کی حلاوت ہے...... فراق کی شاعری میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔" (یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر)

فراق صاحب کی "روپ" چھپی تو لکھنو کے ثقہ حضرات کو اپنی تکلفات اور روایتی شاعری کی دنیا مجروح ہوتی نظر آئی اور فراق صاحب کے خود تراشیدہ جملے، تراکیب، شعری فضا اور نئے نئے الفاظ، ان حضرات کو غیر شاعرانہ نظر آئے۔ کچھ لوگوں نے جو شعر و ادب کو بھی مذہبی تعصب کی نظر سے دیکھتے، اسے ہندوؤں کی دانستہ کوشش سمجھا جو اردو شاعری کے شستہ اور رفتہ مزاج کو آلودہ کر رہی ہے اس پر مستزاد یہ ہوا کہ فراق صاحب نے "اردو کی عشقیہ شاعری" میں یہ مشورے بھی اردو والوں کو اسی زمانے میں دے ڈالے :

"اگر اردو لغت میں دو ڈھائی ہزار سنسکرت الفاظ کا بھی اضافہ ہو جائے، کتنی قوت اور دور رسی، کتنی تہیں، کتنی جھلکیاں اور پرچھائیاں، کتنا رس، کتنا (کتنی) سگندھ، کتنا رچاؤ، کتنا سگھڑاپن، کتنی نئی گونجیں، کتنی خوش تدبیریں، کتنا

تموج اور ٹھہراؤ، کتنی لوچ اور لچک اردو میں پیدا ہو جائے گی۔ اگر سنسکرت الفاظ
کی کرنوں کی کھنک بھی عربی فارسی اور ہندی الفاظ کی کھنک، رس اور جھنکار کے
ساتھ، سازِ اردو میں سنائی دینے لگے ...... سنسکرت الفاظ میں ہندوستان کی سہانی
اور پاک فضا رچی بسی ہوئی ہے ...... تب صحیح معنوں میں اور نہایت اہم معنوں
میں اردو صرف ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کاروباری زبان ہی نہ ہوگی بلکہ ہندو
کلچر کا سنگم بن جائے گی۔" (اردو کی عشقیہ شاعری، ص، ۳۲۔۱۳۱)

یقیناً فراق صاحب کی یہ بات اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا اچھا تجربہ بھی اردو نے ہمیشہ کیا ہے۔ اردو کے سارے افعال سنسکرت ہی سے آئے ہیں۔ علم لسان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ کتنے اردو کے الفاظ اپنی بنیادیں سنسکرت گلاسری میں رکھتے ہیں جن کے بغیر اردو کا کوئی ایک جملہ بھی مکمل اور بامعنی نہیں ہو سکتا اور یہ دعوی نہیں حقیقت ہے جب کہ فارسی، عربی الفاظ کے بغیر، اردو عبارت لکھی جا سکتی ہے جس کا مکمل نمونہ سید انشا کی کتاب "رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی" ہے تو فراق صاحب کے اس قول میں عصبیت نہیں ایک سچائی ہے۔ پھر فراق صاحب نے ایک اور دھماکہ اردو والوں کے لئے یہ کر دیا :-

"اگر اردو نثر اور نظم کو ناگری حروف میں بھی چھاپ دیا جائے اور کچھ مشکل
ٹکڑوں کی شرح دے دی جائے تو گاؤں گاؤں اور گھر گھر اردو پھیل جائے اور
اردو ادب سے لطف اور فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد میں کروڑوں کا اضافہ ہو
جائے۔ اردو کے پرچار (میں) ہندو ماس کانٹیکٹ کا یہ تنہا ذریعہ ہے۔"

(اردو کی عشقیہ شاعری۔ ص، ۱۳۰)

نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے ڈائی ہارڈ اور سخت گیر لوگ بھڑک اٹھے۔ حضرت جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے لکھا۔ "غریب اردو میں خواہ مخواہ سنسکرت الفاظ ٹھونسنا، دوم اپنے آپ کو اچھالنا کہ اب اردو غزل کے امام دو اشخاص ہیں (۱) حضرت فراق گورکھپوری (۲) پنڈت آنند نرائن ملا۔ باقی شاعر جھک مارتے ہیں اور ناقابل اعتنا ہیں۔" پھر اثر نے لکھا کہ فراق صاحب کے مضمون میں سنسکرت کے شبدوں کی کس قدر افراط ہے۔ "جیون چرتر، بھوگ ولاس، سنجوگ بیوگ، سنسکارتا، رچنا کا سپنا، وش سنگھٹ جیون۔" پھر آگے لکھتے ہیں۔ "مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فراق صاحب کو ہندی سنگٹھن سے بھی نکالا ملا ہے کہ تم ہندی کیا جانو؟ ...... تو، اب اردو پر راشٹرپتی آسن جما رہے ہیں۔ (ایک) غزل کا مطلع ہے

عشق تو دنیا کا راجا ہے

کس کارن بیراگ لیا ہے

پہلی ہی بسم اللہ غلط اور مطلع مہمل و بے معنی۔ کیوں کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ بیراگ، دنیا پر حکمرانی کا آلہ ہے۔راجا بنا دیتا ہے۔ عشق کو یہ "راجگی" پہلے ہی سے حاصل ہے لہذا بیراگ لینے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی .... آگے فراق صاحب فرماتے ہیں :

حسن کو تو نے کیا جانا ہے

عشق کو تو نے کیا سمجھا ہے

فراق صاحب کی (اس) غزل پر ۱۹۴۰ء درج ہے.....۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء میں حضرت جگر مراد آبادی نے سندیلے میں ایک غزل پڑھی۔ مطلع یاد ہے :

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے

ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

فراق صاحب نے جگر صاحب کے ایک مصرعے سے پورا شعر گڑھ لیا۔

دھیما دھیما درد اٹھا ہے

اودی گھٹا ہے ٹھنڈی ہوا ہے

یہ المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے۔ زبان کی بھی ایک افسوسناک غلطی ہے۔درد، ہلکا ہلکا یا میٹھا میٹھا ہوتا ہے نہ کہ دھیما دھیما۔" (چھان بین ص، ۲۶۴، ۲۶۷ از اثر لکھنوی)

اب اس طرح کا مطالعہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ شاعری میں اس وقت اور شاید ہمیشہ سے خیال کی اڑان، فلسفیانہ باتوں اور طریق پیش کش کے ساتھ ساتھ آہنگ (Cadence) اور جمالیاتی احساس کو اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ ہاں الفاظ اور معنی کی تہہ داریاں بھی دیکھی جاتی رہی ہیں۔ فراق صاحب کبھی کبھی اس طرح کی باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ کبھی وہ ایسی بہت سی چیزوں کو جانتے بھی نہ تھے اور اگر جانتے بھی تھے تو شاعری کی بلند آہنگی اور خیال کی اڑان اور بات کہنے کے ایک خاص ڈھب کے آگے وہ بہت سی ایسی روایتی باتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے کہ انھیں سب کو خوش رکھنے کا ہنر نہیں آتا تھا۔ اپنے نزدیک وہ جو کچھ بہتر سمجھتے، وہی کچھ کہتے اور لکھتے بھی تھے۔ وہ شاعری کا آفاقی تصور رکھتے تھے۔ اسی باعث اردو کے چھٹ بھیے شاعر اور کم علم حضرات فراق صاحب سے چڑھتے اور پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑاتے کیوں کہ فراق

صاحب سے دوبدو گفتگو کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اپنی تحریروں میں بھی وہ بہت سی ایسی ہی باتیں مسکت ڈھنگ سے کہتے۔ اپنی کتاب ''حاشیے'' میں لکھتے ہیں :-

> ''معاملہ بندی اور ادابندی کی شاعری ہوتی ہے بہت دلکش لیکن آفاقی وسعتیں اس میں نہیں ہوتیں۔ دنیا کے بڑے شاعروں کے یہاں معاملہ بندی اور ادابندی کے اشعار، ان کے کلام کے اہم ترین اجزا نہیں ہیں - تو اور آرائش خم کاکل / میں اور اندیشہ ہائے دور دراز (غالب) داغ کا یہ شعر بھی غالب کے مندرجہ بالا شعر کے مقابلے میں عشقیہ شعر کہلانے کا مستحق نہیں۔ تم کو آشفتہ مزاجوں کی خبر سے کیا کام / تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا (''حاشیے'' ص ۷۹، ۸۱، نیوار پریس، الہ آباد)

اب اگر کوئی اثر صاحب کی طرح، فراق کیا، غالب کا بھی مطالعہ کرے تو ایک منزل یہ بھی آسکتی ہے کہ فراق شاید شاعر ہی نہ رہ جائیں جیسے گیان چند جین نے فراق کی بے عروضیاں ٹائپ کا مضمون لکھ کر کیا ہے۔ گیان چند جین جیسے محقق نے معلوم نہیں کس رو میں یہ مضمون لکھ ڈالا ؟ فراق کے اصل مجموعوں کو دیکھے بغیر ایک نااہل کے ترتیب دئے ہوئے مجموعے کی تمام نااہلیوں کو فراق صاحب کے سر منڈھ دیا۔ حالانکہ گیان چند صاحب جب تک تمام کنویں نہیں جھانک لیتے، ایسا قطعی اور حتمی فیصلہ نہیں کرتے پھر آخر فراق صاحب کے لئے یہ طریق مطالعہ انہوں نے کیوں اختیار کیا ؟ اس کا خراب نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ گیان چند کے سکھائے ہوئے سبق کو دہرانے لگے اور 'چوں نہ دانند حقیقت رہ افسانہ زدند' کا مصداق ہو گئے۔

فراق صاحب کا مطالعے کا اپنا ایک الگ ڈھنگ تھا۔ وہ غزل کو محض ''اچھی'' اور ''بری'' کے پیمانے پر نہیں ناپتے تھے، بلکہ غزل کا خود اپنے ڈھنگ سے تجزیہ کرتے تھے۔ وہ غزل کے شاعر تھے تو غزل کی ماہئیت کا نہ صرف تجزیہ اپنے ڈھنگ سے کر کے اسے سمجھتے بلکہ دوسروں کو بھی اس عمل میں شریک کر کے انہیں بھی اسی خطوط پر شریک مطالعہ کرنے کی فکر کرتے۔ اس میں درپردہ ایک اشارہ یہ بھی ہوتا کہ میرے رنگ غزل گوئی کو بھی اسی طرح سمجھنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ ان کی کتاب ''اردو غزل گوئی'' میں سے ایک اقتباس دیکھتے ہیں :-

> ''میں نے یہ باتیں کیوں کہیں ؟ اس لئے کہ آجکل ''مطلقاً غزل'' یا متداول و متعارف غزل'' دونوں پر لوگ جلدی سے اظہار رائے کر دیتے ہیں اور تنقید کی پیچیدگیوں اور ذمہ داریوں سے جان بچا کر مسائل کو سہل وصاف سمجھ لینے کی

فطری لیکن اہم غلطی کر جاتے ہیں۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔ بڑے بڑے نقاد، بڑے بڑے شاعر اور بڑے بڑے غزل گو یہاں ٹھوکر کھا جاتے ہیں، غزل پر رواروی میں حکم لگانے، اس کو برا کہنے یا اس کی مدح کرنے سے کام نہیں چلتا۔ یہ سب رائے زنی ہے۔ داد تنقید یوں نہیں دی جاتی۔ غزل بہت دق کرنے والی چیز ہے۔" ("اردو غزل گوئی" ص، ۲۶، ۱۹۹۸ء ایڈیشن)

پھر فراق صاحب کے یہاں غزل کے مطالعے میں کچھ چھوٹی موٹی اور باتیں بھی ملتی ہیں۔ جیسے (۱) اردو غزل گوئی لکھنو اور دلی کی تاریک گلیوں سے نکل کر، دوسرے شہروں، صحراؤں اور قید خانوں میں نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتی ہے۔ (۲) آخر ایک نسائی ماتم اور فلسفیانہ یاس و غم میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ فانی کے یہاں "لکھنویت" کہیں کہیں تیز رنگ میں ضرور آتی ہے مگر وہ اوچھی نہیں ہے۔ فانی اپنے دور میں اردو کا پہلا غزل گو ہے جس کے یہاں فلسفیانہ احساس اور انداز بیان کا تیکھا پن پایا جاتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ فراق فکر، تجربے، احساس اور انداز بیان اور اس انداز بیان میں ایک تیکھے پن کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سامنے کی باتیں ایسی نہیں ہوتیں جو روایتی زندگی کے سیدھے راستے سے لی گئی ہوں۔ ان کی شاعری کو اس طرح آنکنے والے کبھی فراق سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ سارے شعری تجربے زندگی ہی سے آتے ہیں مگر انہیں بیان کرنے میں تجذیب کی صورتیں، اظہار کے راستے، زبان کے پیچ و خم، تہذیبی زندگی کے برتاؤ اور پھر فکری اڑان سب کو لے کر چلنا پڑتا ہے۔ کہیں کہیں شاعر ان میں اپنی انفرادی سوچ اور زندگی کی تجذیب کے ذاتی تجربوں، محرومیوں، خوشیوں اور خاص رویوں کو بھی شامل کرتا چلتا ہے جو عام اور روایتی آدمی کے تجربوں سے اس طرح الگ ہو جاتا ہے کہ اس میں عمومیت کی جھلک یا تو مٹ جاتی ہے یا پھر اپنا پھیر بدل کر لیتی ہے۔ فراق صاحب ایسی اظہاریت، طرز تکلم اور بیان کا خاصہ شوق رکھتے ہیں۔ ان کی ایک غزل :

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترک محبت کا بھروسہ بھی نہیں
دل کی گنتی ہے یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

میں عاشق کی نفسیات کی باتیں اور مطالعہ دلچسپ ہے۔ دیار عشق میں تجربے کرنے والے ، غزل کی اشاریت

تجربات کی حقیقت، ایجاب وانکار، دل کا من مانا پن بلکہ منچلا پن اور پھر برتاؤ (Behaviour) کا دباؤ اور یکا یک پن (suddenness) کو شاعر نے "بھروسہ بھی نہیں" اور "اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں" میں اپنے تمدد، حیرت، تشویش اور مجبوری کے ساتھ جس طرح سے سمیٹا ہے بھلا اسے سمجھے بغیر روایتی مطلب نکالنے والے اور صرف قافیہ اور ردیف کی صحت، جماؤ اور آہنگ پر نظر رکھنے والے فراق کے ذہن اور ان کی نیز اس عاشق کی بے چینیوں اور "کیا کروں اور کیا نہ کروں" والی کشمکش کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں یہ فراق کے عاشق کا انفرادی جذبہ، اگر کوئی ہو سکتا تھا تو وہ عاشق کی عمومیت (Generalization) کے ساتھ سامنے آتا ہے جس پر غزل کے عاشق کے روایتی کردار کی شاید کوئی پرچھائیں نہیں ہے۔ نہ "نسائی ماتم" اور نہ واویلا اور نہ "ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں" والی صورت۔ فراق کے یہاں ان صورتوں کو High Seri-ousness والے شعری تموج سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ وہی شعری بلندی اور تموج ہے جو فراق کے ایک دوسرے شعر میں یوں ظاہر ہوتا ہے:

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا
میں سوچتا تھا مرا کوئی غمگسار نہیں

یا پھر ایک دوسرا شعر:

کوئے جاناں کے بھی اک مدت سے ہیں آہٹ پہ کان
اہل غم کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے

اوپر کے شعر میں چند کلیدی الفاظ اور ٹکڑے ہیں۔ "یگانوں"، "بیگانوں"، "جلوہ گہہ ناز" اور "اٹھتا بھی نہیں"۔ یہی اس شعر میں فکر، فن اور مدعا، سب کی فضابندی اور اظہاریت کی خاموش اور بولتی ہوئی تصویریں ہیں۔ اب جب تک قاری ان تمام منزلوں سے گزر نہ لے، وہ فراق کے تغزل کی روح اور عشق کے حقیقی تجربوں کی کیفیت کو نہیں پا سکتا۔ "دل کا من چلا پن"، "بہانے"، "بدگمانیوں کو بہلا لینے کا خوشگوار دھوکا فراق کے یہاں بار بار آتا ہے "بھول گیا ہے سب گلے، آج تو عشق بدگماں"، "ہم آہنگی میں بھی، اک چاشنی ہے بدگمانی کی۔"، "کتنی یادوں کے دیئے آج جلے اور بجھے" "یہ مجبوری عشق نادم" بدرد دل کیا ہے کھلا آج ترے لڑنے پر"" "تم بھی تو تم نہیں ہو آج رہم بھی تو ہم نہیں ہیں آج" ایسے مصرعوں اور اشعار میں ایجاب وانکار اور اختلافات کی اشاریت فراق کے یہاں بار بار کبھی سامنے سے اور کبھی بہت گھوم پھر کر سامنے آتی رہتی ہے۔ ان میں سے اکثر تجربے لبدائی شکلیں اختیار کئے ہوئے ہیں جنہیں انگریزی تنقید میں

Embodied Experience کہا گیا ہے۔ انہیں محض لفظی موشگافیوں اور بہ انداز حدیث دیگراں، سمجھنے سمجھانے کی جانی بوجھی کوشش نہیں کرنی چاہئے کہ اس طریق تفہیم سے شاعر کے اصلی مدعا اور طریق فکر و فن تک پہنچنا مشکل ہے۔ ہاں کچھ ایسی باتیں ضرور فراق کی شاعری کو Belittle کرنے والوں کو مل سکتی ہیں جن کی بڑی شاعری کی تفہیم میں صرف جزوی حیثیت بن سکتی ہے جنہیں کسی بھی شاعر کے ۔ ان تلاش کیا جاسکتا ہے۔

فراق صاحب یقیناً زبردست قسم کے Egoist تھے اور اپنے دور کے تقریباً اردو کے تمام شعرا سے زیادہ پڑھے لکھے بھی۔ یہاں پڑھے لکھے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بڑی بڑی ڈگریاں علم و ادب کی حاصل کئے ہوئے تھے یا یہ کہ وہ یونیورسیٹی میں استاد کے منصب پر فائز تھے بلکہ یہاں مطلب یہ ہے کہ ان کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا اور وہ کسی بھی ادبی، سیاسی اور سماجی موضوع پر دلائل و براہین کے ساتھ گھنٹوں گفتگو کر سکتے تھے۔ بے تعلق ہو کر اور وابستگی کے ساتھ بھی۔ اور وہ ایسا کرتے بھی رہتے تھے۔ ایک مرتبہ محمد حسن عسکری کے حوالے سے کہنے لگے کہ عسکری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میری غزل کے اشعار میں جو کائنات کی شمولیت ہے وہ اردو کے کسی غزل گو کے یہاں شاید ہی رہی ہو۔ اور مثالاً یہ اشعار پڑھے:

یہ مہکی چاندنی ، یہ نرم لو ستاروں کی
ترے شباب کا آئینہ رات کا جوبن

تو دن کی طرح حسیں رات کی طرح پر کیف
جہاں بھی جائے یہ انداز مہر و مہ جائے

جھلمل جھلمل چھاؤں ترے دن
جگمگ جگمگ تیری راتیں

ہاں عسکری صاحب نے اپنے ایک ۱۹۴۵ء کے مضمون میں ایسی باتیں کی تھیں مگر ایسا تو نہیں ہے کہ فراق صاحب کی یہ مخصوص خصوصیت ہے۔ ولی سے میر، غالب، مصحفی، انشا، آتش سب کے یہاں ایسے اشعار موجود ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ فراق کے یہاں فطرت کی دانستہ شمولیت ہے جبکہ میر کے علاوہ دوسرے شعرا کے یہاں فطرت یا تو ایک Setting بنتی ہے یا محض برسبیل تذکرہ ہے۔ میر

ضرور فطرت کو Involve کر لیتے ہیں۔ بہر حال معشوق مظاہر فطرت بن کر بھی عاشق کے جذبات اور محسوسات میں تموج پیدا کرتا ہے اور اس کے حواس پر چھا جاتا ہے۔ یہ صورت فراق کے یہاں زیادہ مرکوز (Pointed) نظر آتی ہے اور ایک طرح سے تجسیم (Incarnation) کی صورت اختیار کر لیتی ہے جیسا کہ اوپر کے اشعار میں۔

فراق صاحب کی چند خراب عادتیں بھی تھیں جس سے شعر و ادب بھی متاثر ہوئے اور ان کی شاعری بھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے متعلق غلط بیانیوں سے بھی کام لیتے۔ بہت سی بے بنیاد باتیں، دوسروں کے نام سے اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھی پھیلاتے رہتے۔ اس لئے فراق صاحب کے سلسلے میں باتوں کو بہت چھان پھٹک کر سمجھنا چاہئے۔ افواہوں پر اکثر ایسا یقین کر لیتے کہ کوئی انہیں ان کے طے شدہ مسئلوں سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ مگر ادبی مسائل میں ایسا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ ہاں شاعری کے معاملے میں وہ بے حد حاسد تھے۔ اپنے ہم عصروں میں جوش کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ہاں غزل میں یگانہ کے بے حد قائل تھے۔ بعض باتوں کے لئے وہ فرض کر لیتے تھے کہ ایسا تو ہونا ہی چاہئے۔ ایسا ہی شعرا کے متعلق ان کی اپنی آرا ہوا کرتیں۔ اصغر گونڈوی کی عمر کا زیادہ حصہ الہ آباد ہی میں گزرا۔ یہیں ان کی وفات بھی ہوئی۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس اصغر گونڈوی، الہ آباد کی محفلوں میں بہ حیثیت شاعر خاصے مقبول تھے۔ فراق صاحب ان کا لحاظ بھی کرتے تھے۔ اصغر گونڈوی کے کچھ اچھے اشعار بھی سناتے مگر یہ بھی کہتے کہ حضرت اصغر کو "جلوہ"، "پردہ" کہاں سے مل گیا ہے۔ جب دیکھو ہر دوسرے تیسرے شعر میں "جلوہ پردہ"، "پردہ جلوہ" دہراتے رہتے ہیں۔ تصوف محض "جلوہ پردہ" نہیں ہے اور اگر ہے تو آگے بھی کچھ ہے کہ نہیں۔ مشتاق نقوی نے جو باتیں اپنی کتاب "فراق صاحب" میں، فراق صاحب کی زبانی لکھی ہیں، ان میں سے اگر زیادہ تر نہیں تو بہت سی یقیناً غلط ہیں، جنہیں فراق صاحب کی محض ذہنی رو سمجھنا چاہئے اور کچھ نہیں جسے مشل فوکو نے اپنی کتاب The care of the self میں "Dreaming of ones pleasure" کہا ہے جو ایک طرح کا Liaison of sex and self ہے۔ فراق صاحب نے مشتاق نقوی کو اپنے بہت سے ایسے خاندانی واقعات اور معاملات بتائے ہیں جو سراسر غلط ہیں بلکہ ایک طرح کا بہتان ہیں۔ مثلاً اپنے بھائی جدپت سہائے کی بیوی کے متعلق بہت سی بے بنیاد باتیں لکھوائی ہیں۔ اسی طرح کی کچھ باتیں نہرو خاندان کی ایک خاتون کے لئے، اپنے سے متعلق کر کے کہا کرتے تھے۔ یہ وہی Dream of ones pleasure والی باتیں ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فراق صاحب خود کو بے حد خوبرو

آدمی سمجھتے تھے اور انہیں یہ بھی مغالطہ تھا کہ عورتیں انہیں دیکھ کر، ان پر عاشق ہو جاتی تھیں۔ جبکہ ان کے مخالفین اور معاندین انہیں "تمباکو کا پنڈہ" کہتے (یعنی سیاہ فام اور بے ڈول) پھر فراق صاحب خود خاصے اسکینڈل مانگر (Scandal monger) بھی تھے اور بے تکی افواہوں پر جلد یقین کر لینے والے بھی۔ وہ مذہبی آدمی بالکل نہ تھے اور مذہب کی تمام غیر سائنٹفک باتوں کو محض بکواس سمجھتے تھے مگر کبھی کبھی سادھو سنتوں کی تحیر زا باتوں پر یقین بھی کر لیتے، تاہم یہ یقین، آستھا اور اعتقاد کے راستوں سے نہیں بلکہ حیرت اور استعجاب کے راستوں سے آتا تھا۔ الہ آباد میں ایک پنڈت دیا شنکر تھے، وہ علم فراست الیہ (Pamistry) کے ماہرین میں سے تھے۔ فراق صاحب یوں تو پنڈتوں اور پنڈتائی کے بہت خلاف رہتے تھے۔ انہیں یونگا، چونگا، گھونگھا کہا کرتے تھے۔ کبھی یہ بھی کہ "دیکھئے زبانوں اور تہذیبوں کا کیا فرق ہوتا ہے۔ اردو والے کہیں گے تو احمق، الو، بے شعور اور بے وقوف ہے۔ بے دال کا بودم (تمام الفاظ فراق صاحب ہی کے استعمال شدہ ہیں، اس میں زیب داستان کے لئے کچھ بھی نہیں ہے) بھائی تہذیبیں تو اپنا اثر دکھاتی ہی ہیں۔ مگر یہی فراق صاحب دیا شنکر کو کبھی کبھی ہاتھ دکھاتے اور ان کی باتوں پر ہنستے۔ مگر کوئی بات اگر ان کو بھا جاتی تو اسے گرفت میں بھی نہ صرف لے لیتے بلکہ گرہ میں بھی باندھ لیتے۔ ایک مرتبہ دیا شنکر نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا کہ آپ کی قسمت بتاتی ہے کہ آپ ملک سے باہر جا سکتے ہیں مگر اس میں کچھ خطرہ بھی ہے۔ فراق صاحب نے یہ بات گرہ میں باندھ لی چنانچہ جب آخری عمر میں انہیں ایک مرتبہ سویت یونین سے بلاوا آیا تو انہوں نے لاکھ بہانے بنائے اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ چھپوایا کہ فراق بیمار ہیں (Firaq is ill) اور نہیں گئے۔ طرح طرح کے بہانے بناتے رہے مگر اصل خدشہ انہیں دیا شنکر والا ہی تھا۔ ایک مرتبہ قوت ارادی (Will Power) کی بات چلی تو کہنے لگے کہ سوامی وویکانند ایک فولادی قوت ارادی (Iron will) کے آدمی تھے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے سوامی جی کا انگوٹھا چھو لیا تو اتنی زور سے اسے کرنٹ لگا کہ وہ دور جا گرا۔ یہ آستھا نہ تھی بلکہ تحیر اور قوت ارادی کے عجوبے کا اظہار تھا اور بس۔ بیٹھک بازی اور لائٹ موڈ کی باتیں کرنے میں بھی ان کا جواب نہ تھا، مگر یہاں اس مزاج پر کوئی بات نہ کی جائے گی۔ ایسی تمام باتیں مشتاق نقوی نے اپنی کتاب "فراق صاحب" میں جمع کر دی ہیں جو ۱۹۸۴ء میں نرالا نگر، لکھنو سے شائع ہوئی تھی۔ یہ بات میں نے کئی جگہ لکھی ہے کہ فراق صاحب انگریزی ادب کے رومانوی شعرا ہی کے ماہرین میں سے تھے، ڈرامے میں وہ شیکسپئر اور برنارڈ شا پر مہارت رکھتے تھے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں بی اے کی کلاسوں میں یہی دو ڈرامہ نگار پڑھانے کو ملتے تھے۔ انہیں یورپ کے دوسرے ڈرامہ نگاروں کا کوئی خاص اندازہ نہ تھا۔ ناول نگاروں میں وہ ہارڈی

کے بے حد قائل تھے۔ ہمنگ وے اور دیگر ناول نگاروں سے ان کی دلچسپی نہ تھی۔ فرانسیسی شعرا اور ناول نگاروں میں سے شاید ہی کسی کو انہوں نے دل جمعی سے پڑھا ہو۔ صرف وکٹر اوگو کی ارنانی (Hernani) کا کبھی کبھی ذکر کرتے تھے اور موپاساں کی کہانیوں کے وہ بے حد قائل تھے۔ مادام بواری بھی انہیں پسند تھی مگر فلابیر کے طریق تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تحریر میں صاحب تحریر کی شمولیت (Involvement) ضروری سمجھتے تھے جبکہ فلابیر اس کا قائل نہ تھا۔ فراق صاحب کرم کتابی (Bookish) ہونا کبھی پسند نہ کرتے تھے بلکہ ادبی فکر اور سوچ کے وہ قائل تھے۔ وہ مارکسزم کی فکری اور فلسفیانہ صورتوں کے بے حد قائل تھے مگر کمیونسٹ پارٹی کی آپس کی چپقلش جو بعد کو ظاہر ہوئی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ (بقول فراق صاحب) سجاد ظہیر نے ان سے کہا کہ اگر آج شیکسپئر ہوتا تو یقیناً وہ کمیونسٹ ہوتا تو فراق صاحب نے فوراً پوچھا "کون سا کمیونسٹ، روس والا یا چین کے ماؤزے تنگ والا" تو سجاد ظہیر لاجواب ہو گئے۔ یہ قصہ شعبہ اردو میں انہوں نے اس وقت بیان کیا جب چین، ماؤ کی قیادت میں، روس کی موجودہ سیاست اور سوچ سے الگ ہو گیا تھا۔ اس بیان میں فراق صاحب کسی کے جانب دار نہ تھے مگر یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ انہیں اس تقسیم سے دکھ ضرور ہوا۔ فراق صاحب یقیناً "پسند و ناپسند" کے شاعر بھی تھے اور انسان بھی۔ یہ "پسند و ناپسند" لمحاتی بھی ہوتی اور دوررس بھی۔ جب برٹرینڈ رسل کی کتاب Has man a Future? آئی جو نیوکلیر ہتھیاروں کے خلاف ایک احتجاجی کتاب تھی تو ایک دن فراق صاحب کتاب لئے ہوئے شعبہ اردو میں آئے اور بولے حضرات! آپ نے یہ کتاب پڑھی ہے؟ انسانیت کے ڈفنس میں رسل اس عمر میں بھی کتنا Vocal اور احتجاجی ہے؟ اس سے فراق صاحب کی انسان دوستی اور انسانی قدروں کے بچاؤ کے حمایتی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آج کی سیاست نے جو انسان کے قول و فعل میں تضاد پیدا کر دیا ہے وہ فراق صاحب کے یہاں نہ تھا بلکہ وہ اس سے متنفر تھے۔ وہ جواہر لال نہرو کے بے حد قائل تھے اور ان کو ایک بیدار مغز سیاست داں سمجھتے تھے۔ نہرو کی کتاب "تلاش ہند" (Discovery of India) کو فراق صاحب A piece of literature کہتے تھے۔ نہرو کی قیادت کو ہندوستان کے لئے ایک فال نیک سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں فراق صاحب اپنی نظم "دھرتی کی کروٹ" لکھ رہے تھے ہندوستان میں آنے والی تبدیلیوں کو اور خاص طور پر ان کے سوشلسٹ طریق کار کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے جو ایک طرح سے جواہر لال نہرو کا کارنامہ تھا۔ "دھرتی کی کروٹ" میں جابجا سوشلزم اور اس طرز زندگی کی ستائش اسی لئے ملتی ہے۔ شاعری یہ کس معیار کی ہے یہ الگ بات ہے:

اب یہ دھرتی کروٹ لے گی / اب یہ دنیا پلٹا لے گی / بھارت کی کایا پلٹے گی / سب کی قسمت

چمک جائے گی / کاریگر، مزدور کسان / بھارت کے بے چین جوان / دبے دبے بے نام و نشان / ابھریں گے بے شان و گمان / یہی سنبھالیں گے سب کام / ست یگ سے بھی بڑھ کر ہوگا / رام راج سے بڑھ کر ہوگا / برہمن راج سے بڑھ کر ہوگا / ہندو راج سے بڑھ کر ہوگا / مسلم راج سے بڑھ کر ہوگا / محنت کرنے والوں کا راج / کھیتی کرنے والوں کا راج / مال بنانے والوں کا راج۔

اسی طرح "داستان آدم" ان کی انسانی ہمدردیوں اور عظمت انسانی کے اعتراف کی نظم ہے۔ ان دونوں نظموں میں فراق صاحب کی سوچ اور فکر کی اڑان کو دیکھنا چاہئے۔ شاعری تو بہت معمولی ہے، فن کے اعتبار سے اسے صرف نظمانہ (Versification) ہی سمجھنا چاہئے۔ ہاں ان کی نظموں میں شاعری اور فکر کی اڑان کسی کو دیکھنا ہو تو ان کی نظم "آدھی رات" اور "جگنو" کو دیکھنا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہے کہ فراق صاحب کی سوچ کی اصل لائن ان سے غائب ہے۔ وہ جو انہوں نے اپنی نظم "آدھی رات" میں "نظام ثانیہ کی موت کا پسینہ ہے" والی بات کہی ہے، اس کی وضاحت بھی کی ہے کہ "نظام ثانیہ" سے ان کی مراد "سرمایہ داری" ہے۔ ان کی نظموں میں ایسی باتوں پر نظر رکھی جائے تو فراق صاحب ایسی تبدیلیوں کو مارکس کے تجزیے کے مطابق، اسے لازمی سمجھتے ہیں۔ وہ جو ترقی پسندوں خصوصا سردار جعفری سے اختلافات کے باعث کبھی کبھی ٹیڑھی ترچھی باتیں کرتے تھے، ان میں ان کے بہت سے پرسنل مسئلے بھی تھے۔ انہیں مارکسزم اور اشتراکی نظام کی افادیت سے انکار کی صورت میں نہیں لینا چاہئے کہ ایسی بات نہ تو انہوں نے کہیں لکھی اور نہ کسی زبانی بحث میں بھی اس کا کبھی اظہار کیا۔ جو ایک طویل نظم مارکس کے لئے مئی ۱۹۶۸ء میں مارکس کے ڈیڑھ سو سالہ جشن ولادت کے موقع پر لکھی تھی، جو غالباً سویت دیش جائزے میں دلی سے چھپی تھی، اس میں مارکس اور مارکسزم کی جس طرح فراق صاحب نے تعریف کی تھی، اس سے مارکس اور اشتراکیت سے ان کی دلچسپیوں کا اندازہ لگالینا چاہئے۔ یہاں تک کہ جب ویت نام میں امریکہ کو شکست ہوئی تو انہوں نے برجستہ ایک شعر اسی نظم کا یوں پڑھا تھا:

چھوٹی سی ایک قوم نے ہمت ہی توڑ دی
اک دست ناتواں نے کلائی مروڑ دی

تو یہ فراق صاحب کے دل کی آواز تھی۔ یہ شعر فراق صاحب نے راقم کی کتاب "نئی علامت نگاری" کی رسم اجرا کے موقع پر ویت نام میں امریکہ جیسی طاقت ور حکومت کی شکست کا واقعہ بیان کرتے ہوئے پڑھا تھا۔ اپنی تقریر انہوں نے اس طرح شروع کی تھی۔ "صاحبو! آج میں ایک خاص نشے میں ہوں

اور یہ نشہ ویت نام کی کامیابی کا نشہ ہے۔'' اب اگر کوئی فراق صاحب کے ترقی پسندوں کی کار کردگیوں کے اختلاف کو نظر میں رکھ کر ان کی شاعری، یا خود ان کے متعلق رائے قائم کرے گا تو وہ فراق صاحب کی تحریروں سے صحیح نتیجے کبھی نہیں نکال سکتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فراق صاحب کی مارکسزم اوپر سے اوڑھی ہوئی مارکسزم نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس طرح کے ''رڈہاٹ'' (Red Hot) سوشلسٹ تھے جو عموماً پارٹی لیڈر میں ملا کرتے ہیں۔ انہوں نے مارکسزم کو اپنی فکر میں حل کر لیا تھا۔ ان کی نظم ''داستان آدم''، ''بانٹ رہا ہوں'' کے بہت سے اشعار ''دھرتی کی کروٹ'' میں بار بار فراق صاحب کی ہمدردیاں اور ''خراج عقیدت'' (جو مارکس پر لکھی گئی ان کی بڑی اہم نظم ہے) ''دلت، دمن، حبشی امریکہ۔'' کے ساتھ ہیں اور وہ مارکسزم کے چمتکاروں کے گن گاتے ہیں مگر اپنے تجزیوں کی روشنی میں میڈیا کے پروپگنڈسٹ کی طرح نہیں۔'' خراج عقیدت'' (مارکس کی پیدائش کی ایک سو پچاسویں سالگرہ والی نظم) مئی ۱۹۶۸ء میں وہ مارکس کو یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

تھا جس سماج واد کا عالم کو انتظار / یوٹوپیا سے بڑھکے نہ تھا اس کا اعتبار / آرائش خیال تھا، وہ خواب خوشگوار / اک لفظ تھا اٹھے نہ معنی کا جس سے بار / اک علم معتبر اسے کر کے دکھا دیا / اجزائے منتشر کو منظم بنا دیا / تھا وقت منتظر کے سنے وہ ترا پیام / جن راستوں میں تھا نہ کہیں روشنی کا نام / تو نے وہاں چراغ بصیرت جلا دئے / سمجھے نہ تھے جنہیں وہ حقائق دکھا دئے / صدیاں کریں گی یاد تری شان دلبری / تیری کتاب ایک بشارت تھی علم کی۔

جیسے خیالات اور شعری بلندیاں سینتیس بندوں کی اس نظم میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں جس سے فراق صاحب کی مارکس اور مارکس واد سے دلچسپیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ فن کے لحاظ سے بھی نظم میں وہ روانی اور شکوہ ہے جو جوش ملیح آبادی کے مسدسوں پر پہلو مارتے ہیں۔

فراق صاحب کی نظم ''دھرتی کی کروٹ'' میں جو درمیانی اور ذیلی سرخیاں 'کسانوں کی پکار، مزدوروں، کاریگروں اور شلپ کاروں کی للکار' اور 'نئی دنیا' ہیں، ان کو فراق کی ''نا تفہیم'' کے کچھ لال بجھکڑوں نے نئے ہندوستان کے ''گاندھی واد'' اور کانگریسی ارتقا سے جوڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں فراق صاحب کانگریسی تھے بھی۔ لیکن اصل بات یہی ہے کہ ''دھرتی کی کروٹ'' مارکس واد کے تصور کے ساتھ ہی لکھی گئی ہے اور یہ انسانی ارتقا کی کہانی ہے۔ بھلا یہ اشعار گاندھی واد سے کیسے جڑ سکتے ہیں:

جھانک رہا ہے نگر ماسکو / نو یگ کا وہ جروسلم / وہ جادو نرمان کلا کے / لینن گراڈ اور نیپر ڈلم / جیون کی کالی راتوں کا / دھرتی جہاں پتا دیتی ہے / گاتی ہوئی مشینوں کی لے / وہاں چراغ جلا دیتی ہے / ندیوں کا منھ موڑ دیا ہے / ویرانہ لہراتا ہے / ریگستانوں میں اب پانی / گگن کھیلتا جاتا ہے۔

پھر یہ کہ ہماری یہ ساری کوششیں پہلے سرمایہ داروں کی تجوریوں میں بھر جاتی تھیں۔ یہ سرمایہ داری ہمارے ہی خون سے پنپ رہی ہے۔ اپنے پسینے کا جم جانا / دھن پونجی، سرمایہ داری "اپنے پسینے کا جم جانا" پر فراق صاحب نے کارل مارکس کے جملے کا نوٹ لگایا ہے Capital is congealed labour

پھر امریکی سامراج کو ایک انتباہ ہے :

وال اسٹریٹ کے سٹے بازو / کانپ جاؤ اس لشکر سے / ہٹلر، چانگ کے سر اڑا دئے / جس نے اپنی ٹھوکر سے۔

اب یہ الگ بات ہے کہ وال اسٹریٹ کے سٹے باز اپنی سٹے بازی میں جیت گئے تاہم سٹے بازی، سٹے بازی ہی رہے گی انسانی ارتقا کا اس سے کتنا تعلق ہے ہم سب جانتے ہیں۔

یہ بات یہاں پھر دہرائی جاتی ہے کہ فراق صاحب کی مارکس اور مارکسزم سے دلچسپی ایک فلسفیانہ انداز کی تھی جس کے تجزیے میں وہ مارکسزم کی کارکردگی کو بھی شامل کرتے تھے۔ ان کا یہ Enthusiasm ایک پارٹی ورکر کا Enthusiasm کبھی بھی نہ تھا۔ مارکس کے اس ارتقا کو فراق صاحب اپنی شعری فکر میں سمولینے کے قائل تھے، جو ان کی شعری روایت کا حصہ بن جاتا ہے۔

شعری روایت پر یاد آیا کہ فراق صاحب کے چند مخالفین نے، جن میں کچھ تالیاں بجانے والے معمولی شاعر بھی ہیں۔ (اور جن کا خیال ہمیشہ یہ رہا کہ وہ فراق سے بہتر شاعر ہیں) یہ کہا کہ فراق غزل کی روایت سے ناواقف شاعر ہیں۔ وہ دنیا سے زیادہ عامۃ الناس کی دنیا کے شاعر ہیں...... فراق صاحب میں تکنیکی صلاحیت بھی زیادہ نظر نہیں آتی...... وہ بڑے شاعر نہ تھے بلکہ اوسط درجے کے شاعر تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اردو شاعری کی روایت سے پوری طرح بہرہ مند نہ تھے۔ (اردو غزل کی روایت اور فراق، شمس الرحمٰن فاروقی) یہ باتیں تو کسی کے لئے بھی کہی جا سکتی ہیں، جسے ہم پسند نہ کرتے ہوں۔ پھر اردو شاعری کی اصل روایت کیا ہے؟ خود شعری روایت کیا ہے؟ روایتیں وقت، تاریخ اور سماج کے مذاق کے ساتھ بدلتی جاتی ہیں یا جامد اور ازلی ہوتی ہیں۔ مارکسسٹ تو نہیں مانتے کہ روایتیں جامد اور ازلی ہوتی ہیں۔ خود فراق صاحب بھی یہ نہیں مانتے تھے جبھی تو انھوں نے وہ بات کہی تھی کہ ع بدلتی جا رہی ہیں بزم ناز کی روایتیں —— لیکن

اگر روایتیں جامد ہیں تو غزل کی اصل روایتیں کیا ہیں ؟ ان میں اردو شاعری کی اپنی روایتیں کون سی ہیں ؟ فارسی سے اس نے کتنا مستعار لیا ہے ؟ پھر اگر روایتیں جامد ہیں اور ایک ہی دفعہ بن گئیں اور ان میں تغیر یا تبدل نہیں ہو سکتا تو دلی کی روایت ہی ہر دور کے لئے ہونی چاہئے ۔ پھر میر و سودا نے نئی روایتیں بنائیں یا نہیں ؟ غالب اور مومن نے میر و سودا سے الگ غزل کی روایتیں بنائی یا نہیں ؟ اور اگر بنائی ہیں تو وہ کیا ہیں ؟ پھر جامد روایتوں کو تبدیل کرنے کا انہیں کیا حق تھا ؟ آتش اور ناسخ نے دلی کے شعرا سے الگ اپنی غزل کی کیا کیا روایتیں بنائیں ؟ کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ شعرائے لکھنو، اردو غزل کی روایت سے آشنا ہی نہ تھے کیوں کہ انہوں نے مسلمات شاعری کو اپنے ڈھنگ سے بدل لیا۔ ہر فکری اور شعری تبدیلی اپنے آنے والے دور کے ساتھ بدلتی جاتی ہے۔ وقت کے فیشن اور دلچسپیوں کے ساتھ سب کچھ بدلتا جاتا ہے۔ انگریزی شاعری نے بھی Pastroral شاعری سے Grey ، رومانوی شعرا اور پھر آڈن ، اسپنڈر ، ایڈ منڈ ، بلڈن ، سلویا پلا تھ وتڈ ہیوز کے Hawk in the rain تک ایک لمبا راستہ طے کیا ہے تو کیا ان سب کے یہاں شعری روایتیں بدلی ہیں یا نہیں ؟ یا ان میں سے کوئی بھی شعری روایتوں سے واقف تھا یا نہیں ؟ پھر اردو شاعری میں وہ کون سی مجرد ، منجمد اور ازلی روایتیں ہیں جن سے فراق صاحب ناواقف تھے ؟ ان کا نمبر شمار ہونا چاہئے۔ خصوصاً غزل کی وہ روایتیں بیان کی جانی چاہئے جن سے فراق صاحب ناواقف تھے اور احمد مشتاق و ناصر کاظمی ان سے واقف تھے۔ دیکھئے روایت سے ناواقفیت اور شئے ہے اور روایت شکنی اور بات ہے۔ بہر حال جب تک اس کی وضاحت نہ ہو فراق صاحب کی روایت سے ناواقفیت محض مفروضہ اور ایک بہکانے والی بات ہو گی جس میں تھوڑی سی بقراطی بھی شامل ہے۔ ایرانی غزل اور شاعری میں آج جو تبدیلیاں مہین سایہ ، فریدوں توکلی اور فروغ فرخ زاد وغیرہ لائے ہیں کیا وہ رودکی ، فردوسی ، حافظ ، سعدی ، عراقی اور عرفی وغیرہم کی وہی روایت ہے جو ایران یا ستان یا اس کے بعد تھی۔ یہ سب باتیں وہی "ایک چال میری بھی" والی ہیں اور کچھ نہیں۔ اگر روایت سے مراد ہجر و وصال ، فکر و فلسفہ ، معاملات عشق کا ایک خاص ڈھنگ سے بیان ، زندگی کے مختلف برتاؤ اور زبان کا ایک خاص ڈھنگ کا غزل میں استعمال ہے ، تو فراق صاحب کے کلام کا معترضین کو پھر سے ایک کھلے ذہن کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہئے۔ لیکن اگر معترضین کا اردو شاعری اور غزل کی روایت سے مطلب یہ ہے کہ اصل روایت وہ ہے جو ۱۹۶۰ء کے آس پاس "جدیدیت" کی شکل میں نمودار ہوئی جس میں ہفوات اور لایعنیت کا مجموعی طور پر غزل اور عام شاعری میں بھی ایک انبار لگ گیا، تو یہ الگ بات ہے۔ یقیناً فراق صاحب اس شعری اور غزل کی ایسی روایت سے بہرہ مند نہ تھے اور وہ اس غزل کی نئی روایت میں شعر نہیں

کہہ سکتے تھے۔ کیوں کہ یہ غزل کی کوئی روایت تھی بھی نہیں۔ پھر کلاسیکی اور جدید غزل کی روایتیں یقیناً مختلف ہیں، اور ہونا بھی چاہئے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ روایت کوئی جامد اور ازلی نہیں ہوتی۔

تو فراق صاحب کا ایسا بد نما اور ان کی شاعری میں محض کالک پوتنے والا Targeted مطالعہ کبھی فراق کا مطالعہ کرنے والوں کو فراق کی تفہیم کی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا اور یہ مطالعہ نہ صحیح ہوگا اور نہ ہی متوازن۔ دوسری طرف محمد حسن عسکری کا بھی فراق صاحب کا ایسا محاسبہ اور مطالعہ درست نہیں ہوگا۔ محمد حسن عسکری اپنے ایک مضمون فراق صاحب، محررہ دسمبر ۱۹۴۵ء (مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل، لاہور) میں لکھتے ہیں :

"ہمارے دیکھتے دیکھتے اردو شاعری کیا سے کیا ہوئی جا رہی ہے۔ میں تو بس کوئی (اتنی) سی بات جانتا ہوں کہ آج اگر اردو نظم اور نثر میں کوئی چیز پڑھنے کے قابل لکھی جا رہی ہے تو وہ فراق صاحب کی شاعری اور تنقید ہے .... باقی بس اللہ کا نام ہے"

یہ وہ وقت ہے جب ایک طرف یگانہ ہیں، حسرت ہیں، جگر ہیں۔ نئے لوگوں میں مجاز ہیں، سردار جعفری ہیں، مجروح ہیں، جذبی ہیں، مخدوم ہیں۔ پرانوں میں ابھی جوش، آرزو، ثاقب، سائل اور صفی ہیں۔ ناقدین میں نیاز، مجنوں، سرور اور احتشام حسین سے تنقید کے طاق و ایوان روشن ہیں اب یہ کہ فراق صاحب کے علاوہ ۱۹۴۵ء میں نہ تو کوئی شعری تخلیق قابل مطالعہ ہے اور نہ تنقید۔ یہ بھی فراق صاحب کو غلط طریقے سے پڑھنے اور پیش کرنے کا، انتہا پسندی کا دوسرا سرا ہے۔ ہاں وحید اختر کے مطالعے میں یقیناً ایک متوازن صورت ملتی ہے :

"فراق کی غزل کلاسیکی روایت کا عطر مجموعہ ہے۔ ان کی شمع سخن میں تمام اساتذہ کی آوازیں روشن ہیں۔ اس لحاظ سے وہ کلاسیکی غزل کے آخری بڑے شاعر ہیں۔ اسی کے ساتھ دوسری طرف وہ جدید غزل کے پہلے شاعر بھی ہیں۔ روایت سے اتنا گہرا رشتہ رکھتے ہوئے ایک بہت بڑے انحراف کا نقطہ آغاز بننا بہت مشکل ہے مگر فراق نے یہ کام کیا۔"

تاہم فراق صاحب کبھی کبھی ایسے رسالوں میں بھی اپنی غزلیں چھپواتے تھے جو معیاری نہ ہوتے مگر تخلیقات کے لئے خاصہ معاوضہ دیتے تھے۔ اب ایسے رسالوں کے لئے فراق صاحب روایتی ڈھنگ کی بڑی لمبی لمبی غزلیں لکھتے اور پھر انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس قسم کے مختلف رسالوں میں بھیج دیتے اور

سب سے الگ الگ معاوضے وصول کرتے۔ ایک مرتبہ "شمع" دہلی یا "بیسویں صدی" دہلی کے لئے انہیں غزل بھیجنی تھی اور غزل تیار نہ تھی تو اپنے مختلف اشعار جو ایک ہی بحر کے تھے اکٹھا کیا اور انہیں "گڑ بڑ غزل" کا عنوان دے کر رسالہ مذکور کو روانہ کر دیا اور معاوضہ وصول کر لیا۔ فراق صاحب کا یہ عجیب و غریب مزاج تھا۔ اب ایسی غزلوں میں فکر کی بلندی ہوتی نہ ان کا اپنا شعری مزاج اور کلاسیکی سلیقہ اور نہ وہ "غالب، فراق و میر اسی سلسلے کے ہیں" والا احساس اور چیلنج۔ اب ان کے ایسے اشعار کو لے کر کوئی رائے قائم کرنا اور اس سے فراق صاحب کی پوری شاعری کا محاسبہ کرنا مناسب بات نہیں ہے۔ پھر "فراق کا مراق" والے حضرات اگر ان کے ایسے شعروں میں بھی کلیاں اور پھندنے ٹانک کر انہیں بھی قدر اول کی شاعری بتانے لگیں تو یہ بھی فراق کے مطالعے کا نقص ہوگا۔ یہ تو شاید سبھی کو معلوم ہے کہ فراق صاحب فکر، کیفیت، وصل و ہجر کے بیانات اور پیش کش میں اپنے اطراف، دوسروں سے الگ رکھتے تھے۔ غزل کی عام روایت سے ایسے میں ان کے شعری برتاؤ (Behaviour) انوکھے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نئی پیکر تراشیاں اور امیج جو مغربی ادب کے مطالعے سے وہ حاصل کرتے تھے، سب اردو غزل میں شامل کرنے کی فکر کرتے جیسے Inanimate اشیا سے ایسے پیکر بنانا یا نفسیات کی تہ داریوں کو بیانیہ سطح پر لا کر پیش کرنے کی کوشش، یہ سب باتیں اردو کے روایتی غزل گویوں اور شاعروں کو اٹ پٹی، نامانوس اور کبھی کبھی بے تکی سی لگتیں۔ وہ چاہتے تھے کہ فراق صاحب بھی انہیں گھروندوں میں گھومتے رہیں جن کے یہ روایتی غزل گو عادی ہیں۔ اور جب فراق صاحب ان روایتی گھیروں کو توڑ کر آگے بڑھ جاتے تو یہ روایت پرست، فراق صاحب کی ایسی کوششوں کو بے ہنری، غزل کی روایت سے بے خبری اور ان کے عجز بیان کے حوالے کر دیتے۔ یہ روایتی لوگ، نہ ایسے اشعار کی نفسیات تک پہنچتے اور نہ فراق صاحب کی فکری بلندیوں کو اور نہ محبت کے پیچ در پیچ والے تجربے اور ان کے بیان کے کرافٹ تک ان کے رسائی ہوتی۔ چنانچہ اپنی نارسی کو شاعر کی بے امکانی اور بے بضاعتی بتا کر خوش ہوتے:

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا
کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا
آج منا لے، آج منا لے

چھڑا رکھا ہے تجھ سے وسوسوں نے وصل و فرقت کے
انہیں وہموں سے اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

ان اشعار میں تڑپنے ، پھڑکنے کی کیفیت ، شعر کی اوپری فضا سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ ان کی معنویت کو اپنے اندر جذب کر کے تب اوپر ابھر کر لطف حاصل کیا جا سکتا ہے ، جو غزل کا عام قاری فی الفور نہیں پا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان اشعار کی حقیقتیں چاہے لطف کم دیں مگر طبیعت کو ایک ادراکی بے چینی عطا کر دیتی ہیں جو عشقیہ اور عام زندگی کے مسلمات سے روشناس کرانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں ایسے بھی لوگ ملیں گے جو یہ کہتے ہیں کہ فراق صاحب نے ایسا کیا کہا ہے جو اردو غزل میں پہلے سے موجود نہیں ہے ؟ کبھی یہ صحیح بھی معلوم ہو سکتا ہے مگر اس میں فراق کی تلاش ، طریق پیشکش اور ان موجود باتوں تک پہنچنے اور ان کے ادراک کے طریقے ہی ان خیالات اور محسوسات کی جان بن جاتے ہیں۔ فراق صاحب کی انفرادیت بھی یہیں سے شروع ہوتی ہے جس میں نشاط غم اور غم و نشاط سب اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں جو ان اشعار کو عشقیہ شاعری کی روح رواں ہی نہیں بناتے بلکہ کہیں کہیں ان میں آفاقی شان پیدا کر دیتے ہیں۔

تو فراق صاحب کی شاعری کو مختلف پھیروں (Twists) کہیں سپردگی کی مجبوریوں اور کہیں ان کی انا (Ego) کی بلندیوں تک اٹھ کر دیکھنا پڑے گا۔ تبھی ان کے جوہروں کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ اب آیئے فراق صاحب کے کچھ اشعار پڑھتے ہیں :

کچھ ایسی بھی گزریں ہیں ترے ہجر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

اک اداسی بھی لئے ہے کیوں نگاہ ناز یار
یہ پیام زندگی شاید کوئی سنتا نہیں

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکہ ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

اس کے آنسو کس نے دیکھے اس کی آہیں کس نے سنیں
چمن چمن تھا حسن بھی لیکن دریا دریا روتا تھا

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

پلکیں بند ، السائی زلفیں نرم سیج پر بکھری ہوئی
ہونٹوں پر اک موج تبسم سوؤ ہو یا جاگو ہو

اور ہی ہے مقام دل
دیر نہیں حرم نہیں

☆☆

سلیم شہزاد

عرفان ذات کی تکنیک

بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی میں انور خان نے ایک تجریدو تجربہ پسند افسانہ نگار کی حیثیت سے خود کو متعارف کرایا۔ اپنے تمثیل و حکایت کے پیرائے میں اس نے نئے عہد کے سیاسی سماجی طنزیے لکھے اور بیان کا علامتی طریق کار اپنا کر بڑے شہر کے مسائل کو افسانوی روپ دیا۔ اس نے حقیقی کرداروں کے مصنوعی جذبات کو دستاویزی بیان میں بھی پیش کیا اور افسانے کے نام پر تجریدی تمثیلی کرداروں کے سہارے فرد کی ذات اور معاشرے کی لغو صورت حال کی زائچہ نویسی بھی کی یعنی بیسویں صدی کے ربع آخر میں افسانے کے حاوی رجحانات و میلانات اور اس کے سارے اوصاف انور خان کے افسانوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس عہد میں تخلیق کئے گئے اس کے افسانوں پر حاوی اور تاثر آفریں رنگ ان کے ایک مہانگر میں تخلیق کئے جانے کے وصف کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔ جدید زندگی، جدید معاشرہ اور ان کے پیدا کردہ جدید نفسی، طبعی، اجتماعی، سیاسی، مذہبی (عموماً اخلاقی) ثقافتی مسائل انور خان کے افسانوں میں مختلف زاویوں سے اپنے فنی لسانی اظہار سے گزرے ہیں اور اس مطالعے کے شدید متقاضی ہیں کہ انہیں افسانے کے عمومی سیاق و سباق میں خود فنکار کے طرز فکر و احساس، طریق اظہار اور فن کے تعلق سے اس کے روایتی، تاریخی، جمالیاتی اور لسانی تصورات کے مقابل لاکر دیکھا جائے تاکہ اس کے مجموعی تخلیقی عمل کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو۔

انور خان کے تین افسانوی مجموعوں میں سے یہاں تین ہی افسانے منتخب کئے گئے ہیں۔ ''راستے اور کھڑکیاں'' سے ''شاندار موت کے لئے''، ''فنکاری'' سے ''ہوا'' اور ''یادبسیرے'' سے ''کمپیوٹر'' اور یہ اس لئے کہ ان کے مطالعے سے عصری افسانوی فن اور اس کی حدود میں خود مذکورہ افسانوں کے خالق کا تصور فن واضح ہو جائے۔

پہلا افسانہ ڈائنا، ڈیوڈ، چارلس اور افسانے کے حاضر راوی ولیم کے مابین زیادہ تر مکالمات پر انحصار کرتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے طنزیہ محاکاتی جملوں اور ان کی تکرار سے یہاں افسانے کی جو خارجی ہئیت بنتی ہے، افسانوی بیان میں کفایت لفظی کی اچھی مثال ہے۔ یوں بھی انور خان مختصر نویسی میں ماہر فنکار تھا۔

ڈائنا بستر مرگ پر ہے لیکن اس کے ہوش وحواس اس حد تک بیدار ہیں کہ مرتے ہوئے وہ اپنے جنازے میں آنے والوں کو مدعو کرنے کے لئے راوی سے ایک فہرست تیار کرواتی ہے اور اس فہرست میں شہر کے بڑے اور اہم لوگ شامل ہیں۔ میئر، وزیر، سیٹھ، ساہوکار، فلم اسٹار، جج اور جسٹس آف پیس وغیرہ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے افراد جس کے جنازے میں مدعو کئے جائیں تو مرنے والی ہستی معاشرے میں خود کیا مقام رکھتی ہے؟ افسانے سے یہ قطعی ظاہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے کردار جس جگہ رہتے ہیں وہاں کا تذکرہ

بلڈنگ کے لوگوں کا سماجی مرتبہ مشکوک ہے

کہہ کر کیا جاتا ہے جس سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ افسانے کے کردار بہر حال معاشرے میں وہ خاص مقام نہیں رکھتے جس مقام کے افراد کے نام جنازے کی فہرست میں شامل ہیں۔ چنانچہ اسے مرتی ہوئی ڈائنا کی ایسی شدید خواہش کہنا چاہئے کہ نہ سہی زندگی میں، مرنے کے بعد تو میں اہم سماجی افراد سے کوئی رابطہ بنا سکوں چاہے وہ مردے اور میت کے جلوس یعنی مردہ بدست زندہ کا ہی ربط کیوں نہ ہو۔

فرد خواہشات کا مارا ہی ہے۔ ہر خواہش پر جس کا دم نکلتا ہو اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی کا مصنوعی پن اپنی موت اور میت کے جلوس تک کھینچ لے جائے۔ جو فرد مشکوک سماجی مقام والے افراد کے ساتھ جیتا ہو اور جس کے دوسرے اہل خاندان بھی غیر اہم ہوں، اس سے بھی یہ حق کون چھین سکتا ہے کہ جادوئی چراغ کی خواہش کرے اور اس کے جن سے محل دو محلے تعمیر کروالے۔

ڈیوڈ اور ولیم بھی ڈائنا کی طرح مصنوعی زندگی کے اسیر ہیں۔ نہ صرف ان کی فکر بلکہ ان کی ظاہری جسمانی بناوٹ بھی مصنوعی پن سے جڑی ہوئی ہے۔ ڈیوڈ کے نقلی دانت اور ولیم کے نقلی بال اس مصنوعی پن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنی باتوں اور عمل سے وہ ڈائنا کی حمایت کرتے اور ثابت کرتے ہیں کہ مرنے والی کی خواہشات میں انہیں اپنی خواہشات کا عکس نظر آتا ہے۔

ڈائنا کے بیٹے چارلس کا کردار اس افسانے میں نئی / مستقبلی نسل کا کردار ہے جو اپنے تصنع پسند

بزرگوں سے مخالف سمت کا راہی معلوم ہوتا ہے۔ چارلس کو اس کے ماں باپ بلڈنگ کے دوسرے بچوں کے ساتھ ملنے جلنے نہیں دیتے، مبادا اس میں وہ تبدیلیاں آجائیں جو مصنوعیت کو راس نہیں آتیں۔ چارلس کو اپنے ماحول کی قدیم پر اسراریت بھی پسند نہیں لیکن وہ اس ماحول میں قید اور نیا ماتمی سوٹ پہننے پر مجبور بنادیا گیا ہے۔

ابھی ڈائنا مری نہیں ہے، مرنے کا انتظار کر رہی ہے اور ساتھ ہی اس بات سے خوش ہے کہ سماج کے چنندہ افراد کے اس کی میت میں شریک ہونے سے بہر حال اس کی ایک خواہش تکمیل پا جائے گی۔ اس ماحول میں چارلس خود کو اجنبی سا محسوس کر رہا ہے۔ اس احساس کو شاید وہ بچہ بیان نہ کر سکے البتہ راوی اس کا عندیہ دیتا ہے یا قاری کے لئے ممکن ہے کہ

کمرے کا فرنیچر پتھریلی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہا ہے اور چارلس بھی۔

افسانے کے اس آخری جملے سے اس صورت حال کا احساس کرلے۔

تصنع پسندی کوئی آج کا ذہنی رویہ نہیں ہے لیکن اس رویے میں جو زور شور کا دکھاوا شامل ہو گیا ہے وہ آج کی اشتہاریت زدہ زندگی کا نمایاں واقعہ ہے۔ "شاندار موت کے لئے" جس کی مبالغہ آمیز صورت کے طنز فرد کی خود ترحمی اور اپنے آپ میں متضاد ہونے کا متحرک بیانیہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بازگشتی مکالمے اس میں لسانی اظہار کے نقلی پن کی بھی مثال پیش کرتے ہیں۔ ڈیوڈ یا ڈائنا جو کچھ کہتے ہیں، ولیم ان کے کہے ہوئے لفظوں کو دہرا کر ان کی حامی بھر تا جاتا ہے گویا یہ ٹیپ کئے ہوئے جملے ہیں جنہیں بار بار سنا جائے، گویا دکھاوے اور جھوٹ کے مارے معاشرے کے افراد نہ صرف بندھے ٹکے جذبوں اور اصولوں پر جی رہے ہیں بلکہ ان کا باہمی لسانی ربط بھی چند مخصوص جملوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ ان کی خواہشات لامحدود اور بہت اونچی ہیں لیکن ان کی تکمیل کے حقیقی ذرائع سے وہ محروم ہیں۔ ڈائنا کے کردار کے مطالعے سے ڈیوڈ اور ولیم کے تعلق سے بھی یہ تاویل ممکن ہے کہ آج ڈائنا جس شاندار موت کا انتظار کر رہی ہے، اس کی حمایت کر کے ڈیوڈ اور ولیم نے واضح کر دیا ہے کہ کل وہ بھی ایسی ہی موت پسند کریں گے۔

افسانے کا لسانی متن تخلیقی نوعیت کا ہوتا ہے اور چونکہ یہ متن بیان کے بعض تکنیکی انسلاکات کے توسط سے اپنی ہیئت تشکیل دیتا ہے اس لئے افسانوی واقعے کی ترسیل کو ایک مخصوص معنوی نظام کی ترسیل کے مترادف سمجھنا بے جا نہیں۔ بظاہر افسانے کی معنویت تفہیم وادراک کی محدود صورت کا التباس

پیدا کرتی ہے۔ حقیقتاً ایسا ہے لیکن حقیقتاً ایسا ہے نہیں کیوں کہ پیشتر سے مرتب کئے گئے افسانوی لسانی متن کو از سر نو تشکیل دینے کی متعدد مثالیں ادب میں موجود ہیں اور ایک کی بنیاد پر دوسرے متن کی تشکیل سے یہ کلیہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ افسانوی متن یک معنوی نہیں ہوتا۔ فنکار کا لسانی بر تاؤ ایک کردار اور اس کے توسط سے بیان کئے گئے ایک واقعے اور اس کے ماحول کو کثیر جہت معنویت سے متصف کر سکتا ہے۔ متن اساس متن کی تشکیل افسانوی متن کو تکثیر معنی کے نکتے سے ایک مابعد جدید جمالیاتی جہت سے آشنا کر رہی ہے۔ عرصہ پیشتر لکھا گیا افسانوی متن ایک معنی ادا کر کے بالکل بیکار شئے نہیں ہو جاتا اس لئے متن ساز ماضی کے افسانوی لوازم میں کچھ نئی معنوی سطحوں کا اضافہ کرنے کا تجربہ کر رہا ہے۔ اس ضمن میں اس کی عصری فکر جو موجودہ متغیر ماحولیاتی اقدار کے پیش نظر لسانی ساختوں میں نئی معنویتیں داخل کرتی ہے، خاصی فعال نظر آتی ہے۔

تمثیل اور حکایت بیان کے ایسے پیرائے ہیں جن سے صوری اور معنوی مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جس شئے کا بیان مقصود ہو، فنکار اسے اس کی صفات کے ساتھ دوسری شئے میں دریافت کرتا اور دوسری شئے کے حوالے سے پہلی شئے کا اظہار کرتا ہے۔ بازگوئی کی یہ تکنیک جدید افسانوی بیان میں ایک مقبول روایت بن چکی ہے۔ انور خان کا افسانہ "ہوا" اسی تکنیک کے پیش نظر "مینڈک اور بیل" کی حکایت کے پیشتر سے رائج افسانوی متن کی مختلف معنوی جہات کے اضافے سے باز تشکیل کرنے والی تخلیق ہے۔

> قصہ دراصل یہ ہے کہ ایک کنویں کے پاس چند مینڈک رہا کرتے تھے۔ ایک دن کنویں کی منڈیر پر پھدک رہے تھے کہ وہاں سے آنکھوں پر موٹی سی عینک لگائے ہوئے ایک بیل گزرا۔

اس کے بعد سارے مینڈک اپنے آپ میں ہوا بھر کر بیل بننے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور یہ مینڈک اب صرف کنویں کی منڈیر تک نہیں بلکہ فٹ پاتھ، سڑک، چوراہے، موٹر گاڑیوں کے بیچ، جلسے جلوس میں اور ہر سماجی رابطے کے مقام پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ علم و خرد، مذہب و سیاست اور معیشت و جنس غرض حقیقی بیانیے سے تمثیلی رخ اختیار کر کے "ہوا" ایک سماجی طنز اور بیماری بن جاتی ہے جس کے علاج کی کوششیں جاری ہیں لیکن علاج ممکن نظر نہیں آتا۔

اگرچہ ہوا بھرے مینڈکوں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے سیمینار اور جلسے منعقد ہونے لگے ہیں۔ لیکن صورت حال یہ ہے کہ

ہر شام میں اور میرے ساتھی اپنے کنویں کی منڈیر پر ملتے ہیں اور اس وقت کی
یادوں کو تصور میں جگانے کی کوشش کرتے ہیں جب ہم بھی خوبصورت چھوٹے
موٹے سڈول مینڈک تھے۔

تمثیل نگاری افسانے کا ایک معروف رجحان رہی ہے۔ اپنے افسانے "ہوا" میں کلاسک متن پر مبنی سیاسی، سماجی طنزیہ متن افسانوی بازگوئی کے رجحان میں انور خان ایک بنیاد گزار فنکار کے مرتبے پر پہنچ گئے ہیں۔

"کمپیوٹر" ان معنوں میں ایک تمثیلی افسانہ ہے کہ مشین کی تمثیل سے آدمی کی اور آدمی کی تمثیل سے مشین کی اپنے ماحول میں کارکردگی کو دونوں کی طبعی اور فکری جہات کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کا فنکارانہ عمل یہاں سامنے آتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں شائع "یادبسیرے" میں شامل اس افسانے میں کمپیوٹر تکنیک، اس کا سماجی اور علمی تفاعل، انسانی ذہن و فکر پر اس کے اثرات اور اس وقت کے مستقبل اور موجودہ حال تک کمپیوٹر اور آدمی کے باہمی طبعی نفسی ربط ضبط کے موضوع کو، منتخب کرنا پندرہ سال پہلے ہی انور خان کو ان افسانہ نگاروں سے بہت آگے دکھانے کے لئے کافی ہے جو آج خود کو مابعد جدید پس ساختیاتی اور ماورائے اظہار افسانوی متن ساز کہتے نہیں تھکتے۔

امریکہ سے ایک جدید ترین کمپیوٹر بھارت لایا جاتا ہے۔ دونوں مقامات پر اس ذہنی مشین کے مشینی تعملات، مشینی افکار (جنہیں انور خان نے تخلیلی بیانیہ ہونے کے رخ سے اس مشین سے ربط رکھنے والی گوشت پوست کی مشینوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے) اور الکٹرونک رشتوں / سرکٹوں کے جوڑ اور بالآخر ایک یادداشت خانے کی تنظیم سے اٹھتے غیر مشینی تاثرات کو ایک ایسے افسانوی متن میں نمود کرتے دیکھا جاسکتا ہے جہاں مشین آدمی ہے اور آدمی مشین۔ انور خان نے امریکہ میں اس چیز کے انسانی روابط کے بیان سے بھی گریز نہیں کیا اور بھارت لائے جانے والے کمپیوٹر (جسے وہاں پہلے ایک نمبر پھر سقراط کا نام دیا جاتا ہے) اور اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیوں کے خیالات سے اس ملک میں مرد عورت کے نفسی رشتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اصل تفاعل اس مشین کا بھارت کے توہم پرستانہ، مذہبی ماحول میں کھلتا ہے جب اس کے افتتاح کے وقت سائنس سنٹر کے انچارج کے (مذہبی) گرو نے

گنپتی کی تصویر اور ناریل، پھول اور سوجی کا حلوہ اس کے سامنے رکھ کر پوجا کی اور پھر سوئچ آن کر دیا۔

امریکہ میں سقراط کہلانے والے کو بھارت میں شنکر کا نام دیا جاتا ہے۔ ان ناموں سے ظاہر ہے کہ

فلسفے اور مذہب کے افکار جڑے ہوئے ہیں اور انچارج سائنس داں رمیش کے ساتھ شنکر یعنی ہمارا کمپیوٹر وجود، خالق ازل، وجودی تفریق، مسرت وغم، زمان ومکاں وغیرہ موضوعات پر بحث کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہیں انور خان بطور انسان اپنے صلح کل کے مسلک کے ساتھ سامنے آتا ہے:

> ہر چیز کی اپنی ایک خوبصورتی ہے، رنگوں کی ایک دنیا ہے، آوازوں کی ایک دنیا ہے۔ ایک ایک چیز کی تھاہ پانے کے لئے کتنی عمریں چاہئیں؟ تو ان کا بنانے والا کتنا زبردست ہوگا، اس کا ذہن کتنا عظیم الشان ہوگا!

انسانی اور مشینی ذہن سے مظاہر کائنات کی تخلیق کرنے والے ذہن تک پہنچنا ہی دراصل اس افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ لفظی فلسفیانہ مباحث کے علاوہ اسے دھیان اور مراقبے کے عملی مظاہرے سے بھی انور خان نے افسانے میں بیان کیا ہے:

> رمیش کو یہی محسوس ہوا جیسے وہ صدیوں سے چل رہا ہو۔ یہاں تک کہ اس نے دیکھا کہ وہ بالکل دھرتی کے سرے پر آگئے ہیں۔ اسے خوف محسوس ہوا مگر (اس کے گرو) وینکٹ چلم نے اسے تسلی آمیز نگاہوں سے دیکھا کہ گھبراؤ مت، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ دوسرے ہی لمحے وہ خلا میں تھے۔

کسی قدیم رزمیے کے پاتالی سفر کی طرح یہ ذات کی اتھاہ گہرائیوں کا سفر ہے جو افسانوی کردار کو عرفان کی منزلوں تک لے جاتا ہے:

> رمیش نے اس روشنی کو اپنے اندر اترتا محسوس کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اور اس کا گرو اب مجسم روشنی بن چکے ہیں، اب وہ سرتاپا آنند تھے۔

یہ صرف رمیش کا روحانی سفر نہیں ہے بلکہ ذات وکائنات کے مباحث میں کمپیوٹر بھی اپنے ذہن میں پیدا ایسے شکوک کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنے الکٹرانک ذہن سے جو انسانی ذہن کی تقریبا نقل ہے، کبھی سکھ اور کبھی دکھ کا احساس کرتے ہوئے انہیں جاننے کی کوشش میں اپنے بنانے والے کے ذہن کے عرفان کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ جس وقت رمیش اپنے گرو کے ساتھ سرتاپا آنند بنا ہوا ہے، اسی لمحے اس کے ذہن سے مربوط اس کے کمپیوٹر کا ذہن بھی آنند کے ماورائی سکھ سے گزر رہا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں رمیش کے آپے میں واپس آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کمپیوٹر کے تمام سرکٹ جل چکے ہیں۔

زیر مطالعہ افسانوں کے کرداروں کے علاوہ بھی انور خان نے اپنی فنکاری سے جتنے کردار تخلیق

کئے ہیں سب کے سب مادی، طبعی، نفسی، فلسفیانہ، علمی، سماجی وغیرہ مسائل سے جوجھتے نظر آتے ہیں۔ کسی مہانگر کی فلک بوس عمارت میں جینے والے اعلیٰ فرد سے لے کر جھونپڑپٹی کے گندے غیر اخلاقی ماحول میں جینے والے اسفل فرد تک کی زندگی، اس کے مسائل اور نشیب و فراز ڈائنا، ڈیوڈ اور ولیم کے مصنوعی بڑپن کے دکھاوے، ہوا بھرے مینڈکوں اور مشینوں کے درمیان جینے والے دانشور افراد کو کسی نہ کسی نقطے پر ضرور ہم رشتہ کرتے ہیں۔ انور خان کا چھوٹا بڑا ہر کردار یقین وگماں، کذب وصدق، تعلق ولاتعلق غ ہ کی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اپنی خواہش کی دکھاوے کی تکمیل (کی تیاریاں) اپنے علم و فضل، مال ومتاع، حسن وخوبی کا ہوائی روپ اور مشینوں کے درمیان مشین نہ بنے رہنے کے لئے اس کی روحانی تڑپ عمومی لحاظ سے یہ سب عصری اردو افسانے کے عوامل کہے جاسکتے ہیں جنہیں بیسویں صدی کے اواخر میں لکھے گئے "کمپیوٹر" سے اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے آج کے مابعد جدید ثقافتی صارفیت یا صارفی ثقافت کے افسانوی متون کے مختلف رنگوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

☆☆

حسین الحق

شفق کا نیا ناول —— بادل

شفق ایک کہنہ مشق اور معتبر افسانہ نگار ہیں۔

اردو افسانے کی تاریخ شفق کے ذکر کے بغیر ادھوری رہے گی، موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر ان کے یہاں ارتقائی تبدیلی کے اثرات ہویدا ہیں۔ راقم ان کے اسلوبیاتی ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون بہت پہلے قلمبند کر چکا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ یہ ناچیز شفق کا معترف، مداح اور عاشق تینوں ہے۔

اس وقت پیش نظر ہے شفق کا نیا ناول —— "بادل"

خوبصورت کتابت و طباعت اور دامن کش دیدہ و دل سرورق کے ساتھ پیش کیا گیا یہ ناول اپنے قاری کیلئے دلچسپی کے متعدد اسباب فراہم کرتا نظر آتا ہے۔

کتاب کی پہلی قرات یہ احساس دلاتی ہے کہ یہ ایک قابل مطالعہ رومانی ناول ہے جس میں ہیرو (خالد) اور ہیروئن (سلمیٰ) کے سہارے ایک خالص رومانی قصے کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ خالد اور سلمی دونوں ایک آفس میں کام کرتے ہیں۔ سلمی زمانے کی ستائی ہوئی ایک مظلوم لڑکی ہے جو ابتدا میں مردوں کے تصور سے کانپتی نظر آتی ہے کیوں کہ اس کا بہنوئی امجد اس کی بہن کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کر چکا تھا جسے یاد کر لینا ہی سلمی کی "مرد مخالف نفسیات" کے لئے مہمیز کا کام کرتا تھا مگر آہستہ آہستہ خالد سلمی پر کھلتا گیا اور سلمی خالد کو پہچانتی گئی اور پھر ایک وقت وہ آیا جب سلمی اور خالد ایک ہو گئے۔ اس بیچ میں کبھی رامو کبھی نعیم کبھی خالد یا سلمی کے ان دیکھے دشمن تھوڑی دیر کے لئے "ظالم دنیا" کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں مگر بالآخر محبت جیت جاتی ہے۔

ناول کی دوسری قرات یہ احساس دلاتی ہے کہ یہ تو سامنے کا قصہ ہے اس کے پس پشت تو انسان

کی وہ ازلی تگ ودو ہے جو اپنے خلا کو پر کرنے کے لئے، اپنے نصف وجود کو مکمل کرنے کے لئے، تعمیر شخصیت کے مراحل میں محبت کے ظلمت سے نور کا ڈھنے کے لئے، اپنی ازلی جبلت تسخیر کے غیر متشددانہ تفاعل کے اظہار کے لئے انسان مسلسل کرتا رہا ہے۔

ناول کی تیسری قرات اس کا بھی احساس دلاتی ہے کہ اس رومانی ناول یا Love story میں زندگی کے وہ سارے چھوٹے بڑے دکھ سکھ، آنسو اور ہنسی، دھوپ چھاؤں، نشیب و فراز زندگی کی طرح اس ناول کی بنت کا حصہ ہیں جو کسی بھی زندگی اور زندگی کے کسی بھی قصے کا لازمی عنصر ہیں مثلاً آپی اور پروفیسر نیاز احمد کی اچانک موت، امجد کا غیر انسانی رویہ، نعیم اور خالد کی دوستی، خالد کی قیام گاہ پر پولیس کا چھاپہ، نعیم کا خود کو اپنے والد کی موت کا سبب سمجھنا، یہ ایسے چھوٹے چھوٹے Touches ہیں جن سے نہ کسی زندگی کو مفر ہے نہ کسی قصے کو۔

ناول کی چوتھی قرات اس ناول کے Socio political structure کی طرف بھی کچھ اشارے کرتی ہے باوجود کہ یہ اشارے مدھم ہیں، ناول نگار کے کسی شعوری تخلیقی ارادے کا حصہ نہیں معلوم ہوتے، قصہ کے آگے بڑھنے میں یہ کسی طرح ناگزیر عنصر بنتے نہیں دکھائی دیتے لیکن فی زمانہ ادب کا چھکڑا ہانکنے والوں کی طرف سے Socio political pressure کا جو منظر نامہ تیار کیا گیا ہے، یہ سارا کچھ اس منظر نامے کے مدار کے اندر کا نقش قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں :

(۱) سوچا تھا کینٹن میں کسی اپنے سے ملاقات ہو جائے گی۔ خالد نے لفظ اپنے پر خاص زور دیا۔ تو رہائش کے مسئلے پر مدد مانگوں گا اور دفتر والوں کی ذہنیت کا بھی اندازہ ہو جائے گا (ص ۸)

(۲) معاملہ مذہب کا نہیں ان حالات کا ہے جس کی ابتدا ملک کے بٹوارے سے ہوئی تھی۔ فسادات کے سلسلے نے اس سلسلے کو قائم رکھا اور مسجد کے انہدام کے بعد تو...... (ص ۱۱)

(۳) پتہ نہیں لڑکی ہندو ہے یا مسلمان ؟ اب تو شناخت بھی باقی نہیں بچی، پہلے لباس اور آنکھوں کے حجاب سے اندازہ ہو جاتا تھا، اب نہ آنکھوں میں حجاب ہے اور نہ لباس کی الگ پہچان (ص ۱۲-۱۱)

(۴) کہنے کو تو وہ حقوق نسواں کے لئے لڑائی لڑ رہی ہے، اسے مرد ذات سے نفرت ہے، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، نئے عہد کی عورتوں کا کریز، خود کو موڈرن کہلانے کا شوق (ص ۴۸)

(۵) محلہ پٹھان ٹولی اس کے شہر کے مسلم محلوں سے الگ نہ تھا، وہی گندگی، نالیوں میں رنگ برنگی پولیتھن تھیلیوں میں گھروں کے کوڑے، پرانے خستہ مکانات کے درمیان کوئی نئی عمارت، چھوٹی چھوٹی گمٹیاں، بیچ پر

بیٹھ کر گندی پیالیوں میں چائے پیتے لوگ، مرغیاں، بطخیں، بکریاں...... یہاں کچھ اچھا نہ تھا مگر سب سے اچھی چیز اپنائیت اور احساس تحفظ تھا (ص ۵۶)

(۶) پولیس کا کیا بھروسہ، فساد میں دیکھ چکا ہوں، ایک گھر سے اگر دس بم نکلا تو دس نوجوانوں کو پکڑ کر ایک ایک بم سب کے نام دکھادیا، اسی طرح ایک ایک لڑکی...... (ص ۶۷)

(۷) سینگ ام ال اے ہے، اسی کے دم سے شہر میں لاقانونیت کا بازار گرم ہے، ہر جرم کے پیچھے اسی کا دماغ کام کرتا ہے (ص ۱۱۸)

(۸) فساد کے زمانے میں شہر فوج کے حوالے کر دیا جاتا ہے، زمانہ امن میں یہ شہر غنڈوں کے حوالے ہے۔ (ص ۱۱۹)

(۹) تم اپنے کام سے کام رکھو، دوسروں کے معاملوں میں دخل نہ دو، چاہے تمہارے سامنے کسی دوکان دار کی پٹائی ہو رہی ہو، موٹر سائکلیں چھینی جا رہی ہوں، کسی کا قتل ہو رہا ہو، اغوا ہو رہا ہو، تم وہاں ٹھہرو گے نہیں، یہ شہر اب شریفوں کے رہنے کے لائق نہیں رہ گیا ہے۔ غنڈہ راج ہے اور یہ سیاست کے کرمنلائزیشن کا نتیجہ ہے (ص ۵۶۔۵۵)

مذکورہ بالا صورت احوال، مناظر اور بیانات میں کتنا کچھ تخلیقی مشاہدے اور بیان کا حصہ ہے اور ایسے کتنے اظہارات میں سماجی دباؤ اثر انداز ہوا، اس پر گفتگو باقی ہے۔ فی الوقت دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جو ناول پہلی قرات میں خالص رومانی ناول محسوس ہوا وہ چوتھی قرات میں سماجی و سیاسی اثرات کا بھی امین بنتا دکھائی دے رہا ہے۔

ناول کی پانچویں قرات شماریاتی لحاظ سے تو پانچوں قرات ہے مگر آئندہ سطور میں جس پہلو کی طرف اشارہ کرنا ہے وہ پہلو بقیہ چار قراتوں کے درمیان بھی سر اٹھاتا رہا ہے کہ اس ناول میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ اس عرصہ دار ورسن پر محیط ہے جس کا عنوان ہے "اسامہ بمقابلہ بش" یا افغانستان بمقابلہ امریکہ یا بے وقوف بمقابلہ عقلمند۔ یہ سلسلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ چند مہینے جاری رہا۔ انہیں چند مہینوں میں ناول کا ہیرو پہلی نظر کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے اور بش کے فاتح افغانستان ہوتے ہوتے ہمارا ہیرو بھی فاتح محبت ہو جاتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو خالد ریڈیو اور ریڈیو پر بھی خاص طور پر بی بی سی سننے کا عادی ہے لہذا وہ دفتری اور قلمی مصروفیات کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپی خبریں سننے میں ہی محسوس کرتا ہے۔ اس ناول میں پنٹاگن پر حملے سے "سقوط کابل" اور "ظہور انتھراکس" تک کے مراحل عالمی میڈیا کے سہارے بیان بھی کئے گئے ہیں

اور میڈیا کے بیانات پر اس زمانے میں ہندوستان کے مختلف طبقات جس قسم کا خیال ظاہر کر رہے تھے، ان تمام خیالات کو بہ حسن وخوبی رقم بھی کیا گیا ہے جن میں شک اور بد گمانی کو اولیت حاصل رہی۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔ مسلمان اپنی پسند کی خبریں اچھالتے رہے اور مسلم مخالف حلقے اپنے کام کی خبروں پر فوکس مارتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور کل بھی جاری رہے گا۔ شفق نے اپنے انتخابی حق اور انتخابی مزاج کے سہارے اسے جس انداز میں پروجیکٹ کیا یہ پروجکشن اردو ناولوں کے تناظر میں غالباً اولیت کا حامل ہے۔ میں ان کے تمام تجزیوں اور بیانات سے نہ دم گفتگو مطمئن تھا نہ دم تحریر مطمئن ہوں مگر اس کے باوجود ان کی اس کوشش کا اعتراف ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ اعتراف بھی اشد ضروری ہے کہ اس پورے قصے میں "قضیہ افغانستان' فٹ ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ خالد کا کوئی نفسیاتی معاملہ ہو سکتا ہے مگر نعیم، سلمی، رشمی اس چکر میں پڑتے دکھائی نہیں دیتے اور اس ضمن میں سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اگر مشتاق احمد نوری چاہیں گے تو اس پورے ناول میں سے افغانستان کا قصہ بالکل الگ کر کے شفق سے کہیں گے کہ "شفق صاحب - یہی نا آپ کا اصل قصہ ہے؟"

اس سوال سے مزید کئی سوالات کی گنجائشیں پیدا ہو سکتی ہیں مگر چوں کہ شفق کے اس نئے ناول پر میری اس تحریر کی حیثیت افتتاحی تحریر کی ہے لہذا میں آئندہ ہونے والی گفتگو کے لئے ممکنہ طرفیں کشاد کرتے ہوئے فی الوقت اس نئے ناول کا استقبال کرتا ہوں اور انتظار کے منطقے میں واپس جاتا ہوں، جہاں سے دیگر ناقدین اور قارئین کے ظرف وطرف کا مشاہدہ آسان ہو گا-!!

☆☆

اقبال حسن آزاد

بادل —— ایک تجزیاتی مطالعہ

عہد حاضر میں ادب کی تمام شعری و نثری اصناف میں ناول ہی ایک ایسی صف ہے جس میں انفرادی واجتماعی جذبات واحساسات اور تمام موضوعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس میں داخلی کیفیات کے ساتھ ساتھ خارجی زندگی کے حقائق اور اس کے مختلف عوامل پر تفصیل سے لکھنے کی آزادی ہر ناول نگار کو حاصل ہے۔ ناول اپنے زمانے اور ماحول کا آئینہ ہوتا ہے۔اس میں انسانی زندگی کے سیاسی وسماجی، تہذیبی وثقافتی، تاریخی وتمدنی انتشار اور ترقی وتنزلی کی تصویریں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ یعنی ناول زندگی کے تجربات ومشاہدات اور واقعات وحادثات کا ایک مربوط سلسلہ ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ناول نگاری کو ایک فلسفیانہ مشغلہ قرار دیا گیا ہے۔

شفق ایک مشہور ومعروف افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے ہمیشہ تمثیلی اور مجرد انداز بیان کی جگہ اہم سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے فن کا موضوع بنایا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کے مسائل مثلاً فرقہ پرستی، کرپشن، مفلسی اور انسانی اقدار کے انحطاط سے نہ صرف متاثر ہیں بلکہ بے چین بھی ہیں۔

اردو کے بیشتر افسانہ نگاروں نے ناول لکھے ہیں مگر ان میں اچھے ناولوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں چند نئے ناول ضرور سامنے آئے ہیں مگر ان میں سے چند ایک ہی ناول قارئین کی توجہ اپنی جانب کھینچ سکے۔بقیہ ناول ہلکے بادلوں کی طرح یوں آئے اور یوں گئے۔ ’’بادل‘‘ شفق کا دوسرا ناول ہے۔اس سے قبل ۱۹۹۲ء میں انہوں نے ’’کانچ کا بازیگر‘‘ تحریر کیا تھا جس نے اپنے جدید رنگ وآہنگ کی بنا پر ادبی حلقوں میں کافی ہلچل مچائی تھی۔

’’بادل‘‘ کی کہانی ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ اس روز امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پنٹاگن کی عمارت پر یکے بعد دیگرے تین جہاز ٹکرائے تھے۔اس واقعہ سے پوری دنیا میں ہلچل سی مچ گئی تھی

اور حقیقت یہ ہے کہ اس تاریخ نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ امریکہ نے اس کی ذمہ داری اسامہ بن لادین اور اس کی تنظیم القاعدہ پر ڈال دی اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کی جو سازش برسہابرس سے چلی آ رہی ہے اسے مزید تقویت پہنچانے کے لئے ذرائع ابلاغ نے پوری طاقت لگا دی:

> ”صدر نے اعلان کیا ہے ہم اس جرم کے کرنے والوں اور ان کے پناہ دینے والوں کو نہیں بخشیں گے۔ اشارہ جس طرف تھا خالد کا ذہن فوراً وہاں پہنچ گیا۔ وہ تو عرصے سے ان کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ کریں نہ کریں الزام انہیں کے سر جائے گا۔ آج اشارہ کیا ہے کل انگلی اٹھائیں گے اور پھر ان کا نام لیا جائے گا“ (ص ۸۔۷)

اور یہی ہوا۔ امریکی اور اتحادی فوجیں پورے افغانستان کو قبرستان بنانے کے لئے نکل کھڑی ہوئیں۔ اسامہ بن لادین کو ایک ہوا بنا کر پوری دنیا پر سوار کر دیا گیا۔ حالانکہ ٹریڈ ٹاور پر حملے کی ذمہ داری جاپان کی ریڈ آرمی نے قبول کر لی تھی اور کہا تھا کہ یہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی کا بدلہ ہے۔ مگر ریڈ آرمی کے اس بیان پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ اس حملے میں پانچ ہزار افراد ہلاک ہوئے تھے۔ پانچ ہزار کے عوض پچاس ہزار افراد ہلاک کر دئے گئے مگر نہ تو اسامہ بن لادین تک امریکہ کی رسائی ہو سکی اور نہ ہی ملا عمر پر ہاتھ ڈالا جا سکا۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں شفق نے اپنے ناول ”بادل“ کی تشکیل کی ہے اور اس کی تشکیل کے لئے ناول نگار نے ایک قصہ ترتیب دیا ہے۔ کیوں کہ کہانی کی کوئی بھی صورت ہو بنیادی طور پر اس میں قصہ پن کا ہونا لازمی ہے۔ ناول میں ایک ساتھ تین قصے چلتے ہیں۔ پہلا قصہ ناول کے ہیرو خالد کا ہے۔ خالد ایک تعلیم یافتہ، مہذب اور خوبرو نوجوان ہے جو ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو ایک آفس میں بہ حیثیت اسسٹنٹ جوائن کرتا ہے۔ اسی آفس میں ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی کام کرتی ہے جسے دیکھ کر خالد کے دل کی دھڑکنیں ناہموار ہو جاتی ہیں۔ مگر وہ لڑکی اپنے آپ میں اس قدر گم ہے کہ خالد اسے متوجہ کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اس آفس میں رامو نام کا ایک چپراسی ہے، جو خالد کو مشکوک کردار کا شخص معلوم ہوتا ہے۔ اسی دن لنچ ٹائم میں خالد جب کینٹن جاتا ہے تو وہاں ٹی وی پر WTC کے تباہ ہونے کی خبر نشر ہو رہی ہوتی ہے۔ کینٹن کا ماحول گرم ہے اور ایک دو کو چھوڑ کر سبھی لوگ اس کے لئے مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہوتے ہیں۔ خالد کے ذہن پر اس واقعہ اور اس کے رد عمل کا شدید اثر ہوتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات نعیم نام کے

ایک نوجوان سے ہوتی ہے۔دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔خالد ایک متوسط الحال خاندان کا فرد ہے اور اپنے والدین کے بڑھاپے کا واحد سہارا ہے۔اس کی صرف ایک بہن ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔وہ نعیم کو اپنے حالات بتاتا ہے اور اس سے گزارش کرتا ہے کہ وہ اس کی رہائش کا انتظام کر دے۔ نعیم اس کی ملاقات رشمی نام کی ایک دل پھینک سوشل ورکر سے کراتا ہے مگر اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔اسی دوران خالد کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکی مسلمان ہے اور اس کا نام سلمیٰ ہے۔

ناول کا دوسرا قصہ سلمیٰ کا ہے۔اس کے والد کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ان کی دو لڑکیاں تھیں۔ شاذی اور سلمیٰ۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں کی پرورش بیٹوں کی طرح کی تھی۔وہ انہیں بہادر اور مستقل مزاج دیکھنا چاہتے تھے۔وہ اعلیٰ اقدار کے حامل تھے اور توہمات سے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ان کے پاس امجد نام کا ایک مالدار لڑکا پڑھنے کے لئے آتا تھا۔شاذی اور امجد ایک دوسرے سے پیار کرنے لگتے ہیں اور جلد ہی دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔شروع کے چھ مہینے تو بہت ہنسی خوشی گزرے۔اس دوران شاذی حاملہ ہو جاتی ہے۔پھر دھیرے دھیرے شاذی کو معلوم ہوتا ہے کہ امجد ایک عیاش اور آوارہ نوجوان ہے۔شاذی اسے ان عیاشیوں سے روکنا چاہتی ہے تو وہ شاذی کو زدوکوب کرتا ہے اور اسے دو ٹکے کے ماسٹر کی بیٹی کہتا ہے۔شاذی اس کی بات نہیں برداشت کر پاتی اور میکے چلی آتی ہے مگر امجد اسے منا کر پھر اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں مشکوک حالت میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔ سلمیٰ کے والد پر اس حادثے کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ اس صدمے کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ سلمیٰ نوکری کر لیتی ہے۔اس کے آفس میں کام کرنے والا نوجوان راجیش اس پر بری نظر رکھتا ہے۔ایک دن آفس سے واپسی پر ایک اوٹو والا سلمیٰ کا اغوا کر لیتا ہے۔ تین دن بعد وہ گھر لوٹتی ہے۔ سلمیٰ اپنے بکھرے ہوئے وجود کو ایک سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے اسی دوران راجیش کا قتل ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کو مرد ذات سے نفرت ہو جاتی ہے۔وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حصار میں قید کر لیتی ہے جہاں کسی غیر کا گزر نہیں مگر خالد اس کے در دل پر دستک دیتا ہے۔ پہلے تو وہ اپنا دامن بچاتی پھرتی ہے مگر آخر کار خالد کے دام الفت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

ناول کا تیسرا قصہ نعیم کا ہے جو بچپن ہی سے شعلہ مزاج تھا۔ تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد جب اسے کہیں نوکری نہیں ملتی ہے تو اس کے والد اسے طعنے دیتے ہیں۔وہ پلٹ کر انہیں ہی مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ انہوں نے اس کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ نہیں دی اور اس کا کیریر بنانے کے لئے کچھ نہیں کیا۔ نعیم کے

والداس کی بات سن کر سکتے میں آجاتے ہیں۔اسی روزان کاایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور نعیم کو-Compassion ate ground پر نوکری مل جاتی ہے۔وہ اپنے آپ کو اپنے باپ کا قاتل سمجھنے لگتا ہے۔اس کی ساری شعلہ مزاجی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک سنجیدہ اور بردبار شخص بن جاتا ہے۔اس کی والدہ اس کی شادی سلمی سے کر دینا چاہتی ہیں مگر وہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔وہ ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی اولاد اس کے ساتھ وہی سلوک نہ کرے جو اس نے اپنے باپ کے ساتھ کیا تھا۔خالد کے سمجھانے پر وہ شادی کے لئے راضی تو ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے شہر کی کسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔

ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے یہ تینوں قصے آپس میں مربوط ہوتے جاتے ہیں۔اس دوران خالد پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے۔جس اٹووالے نے سلمی کو اغوا کیا تھا اسی نے خالد کو جان سے مار دینے کی کوشش کی۔خالد بچ تو جاتا ہے مگر سلمی بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے۔اچانک اس علاقے کے ام ال اے کا کردار سامنے آتا ہے جو Criminal Background رکھتا ہے اور اپنے غنڈوں کے ذریعہ چندہ وصول کرتا پھرتا ہے۔پھر ایک دن خالد غائب ہو جاتا ہے اور شہر میں ایک مسخ شدہ لاش برآمد ہوتی ہے۔نعیم سمجھتا ہے کہ خالد کا قتل ہو گیا ہے۔وہ صدمے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر وہ لاش خالد کی نہ تھی بلکہ اسی آٹوڈرائیور کی تھی جس نے سلمی کو اغوا کیا تھا اور خالد پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔اس کے بعد ام ال اے کا بھی قتل ہو جاتا ہے۔شہر کی فضا کشیدہ ہو جاتی ہے۔اچانک ایک دن خالد لوٹ آتا ہے۔وہ بتاتا ہے کہ اس کے والد کا فون آیا تھا کہ اس کا پبلک ریلیشن آفیسر کی حیثیت سے انتخاب ہو گیا ہے۔فوراجوائن کرنا تھا۔گاڑی کا وقت قریب تھا اس لئے وہ کسی کو اطلاع نہ دے سکا۔وہ اپنی ماموں زاد بہن کی منسوب نعیم سے طے کر کے آتا ہے۔سارے گلے شکوے دور ہو جاتے ہیں۔مگر شہر کی فضا گرم ہے۔ہڑتال کا اعلان ہو چکا ہے اور ہر شخص خوفزدہ ہے۔بقول ناول نگار :

> "فضا کشیدہ ہے۔افواہوں کا بازار گرم ہے۔خوف کا پرندہ بہت نیچی اڑانیں بھرتا ہوا گھروں کی منڈیروں پر بیٹھ رہا ہے......دکانیں بند کرانے والوں کی ٹولیاں ہاتھوں میں آتش گیر مادے لئے اشتعال انگیز نعرے لگا رہی ہیں چنگاری شعلہ بننے کی منتظر ہے اور حکمراں جماعت کے ہاتھ میں بڑے بڑے پنکھے ہیں۔"(ص ۱۳۶)

شفق نے اپنے ناول میں بادل کو ایک طاقت ور استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ناول میں

شروع سے لے کر آخر تک بادل کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔

(۱) آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا (ص ۹)

(۲) میری بات دھیان سے سن۔ کمئے نکلا جا رہا ہے۔ دیکھ وہ کالا بادل۔ شاید تجھے دکھائی نہ دے۔ وہ تیرے گھر پر گرنے والا ہے (ص ۲۴)

(۳) رات کے مہمان کی طرح شام سے آئے بادل برسے جا رہے تھے (ص ۳۱)

(۴) دو بجے دن میں بارش کا زور ٹوٹا۔ بادلوں کے ٹھہرے ہوئے لشکر میں ہلچل مچی۔ بڑے بڑے کالے ٹکڑوں کی اوٹ سے سورج کی کرنوں نے جھانک کر دیکھا (۳۵)

(۵) اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے اور بارش کی تیز بوچھار میں وہ بھیگتی جا رہی ہے (ص ۵۰)

(۶) مختلف سمتوں سے اٹھنے والے جنگ کے بادل ایک نقطے پر سمٹتے جا رہے تھے۔ (ص ۸۱)

(۷) مجھے چاند نظر نہیں آتا خالد۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ اس گھر میں سورج کی روشنی آتی ہے نہ چاندنی۔ بہت کالا بادل ہے جس نے اس گھر کو ڈھک لیا ہے (ص ۱۱۴)

(۸) سلمیٰ کے گھر کے باہر آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہے (ص ۱۳۶)

اس ناول کی ایک اہم خوبی اس کی آئرنی یا تیکھا پن ہے۔ کاٹ دار جملے قاری کے دل پر کسی تیز دھار چھری جیسا وار کرتے ہیں۔ چند جملے دیکھئے:

(۱) یہ اتفاقات بھی عجیب چیز ہیں۔ یہ اتفاق کہ ایک یہودی فوٹو گرافر کیمرہ لئے حادثے کا منتظر تھا۔ یہ اتفاق کہ اسی دن مسلمانوں کے خوشیاں منانے کا ویڈیو ٹیپ مل گیا اور اسے تباہی کے مناظر سے جوڑ کر ڈائرکٹ ریلے کیا جانے لگا اور اتفاق سے اسی دن چار ہزار یہودیوں کو ایک ساتھ ضروری کام پڑ گیا اور انہوں نے اجتماعی چھٹی لے لی۔ خدا جس قوم سے خوش ہوتا ہے اسے اتفاق کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ (ص ۴۳-۴۴)

(۲) خالد اور نعیم نے جیسے تیسے لنچ ختم کیا۔ باہر نکلتے وقت انہوں نے پیچھے سے زہر میں بجھی ہوئی آواز سنی "اب مسلمانوں کا پینٹ اترے گا۔" پھر ہنسی کی آوازیں (۵۴)

(۳) عوام سے ان کا ذہن چھین لیا گیا ہے۔ وہ وہی سمجھ رہے ہیں جو انہیں سمجھایا جا رہا ہے، وہی بول رہے ہیں جو ان سے بلوایا جا رہا ہے (ص ۵۵)

(۴) تہلکہ ڈاٹ کام پر کیا ایسی ہی گرما گرم بحثیں ہوئی تھیں؟ خالد نے پوچھا

"نہیں" کچھ چہ مگوئیاں ہوئی تھیں۔ پہلے دن حیرت اور تاسف کا اظہار ہوا تھا۔ پھر یہ حکومت کے بیان سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اور اپوزیشن پر اعتراض کرنے لگے کہ یہ لوگ اتنے حساس معاملے کو عوام کے درمیان لاکر فوج کا مورل گرانے کی کوشش کر رہے ہیں (ص ۷۷)

یہ حقیقت ہے کہ عوام کے درمیان فرقہ پرستی کا زہر بڑی آہستگی مگر تسلسل کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے اور مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا جارہا ہے۔ مگر اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو اس زہر سے محفوظ ہیں۔ ناول کے دو ذیلی کردار مشراجی اور سریواستو جی دو الگ الگ مکتبہ فکر کے نمائندے ہیں۔ مشراجی یوں تو سلجھے ہوئے انسان ہیں مگر جب فرقہ پرستی کی لہر پھیلتی ہے تو وہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ سریواستو جی اعتدال پسند ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ایسے ہی اعتدال پسند لوگوں کی وجہ سے یہ ملک قائم ہے۔

اس ناول کی ایک اور اہم خصوصیت اس کا دلنشیں اسلوب ہے۔ چند جملے ملاحظہ فرمایئے :

(۱) رانی کلر کے شلوار سوٹ اور دوپٹے میں اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ داہنے گال پر جھولتے ہوئے بالوں کے گچھے نے گال کے ساتھ ساتھ داہنی آنکھ کا کچھ حصہ بھی چھپا لیا تھا۔ گلاب کی کلیوں جیسے ہونٹ ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے اور وہ کمپیوٹر اسکرین پر نظریں جمائے بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ (۵)

(۲) صاف آسمان میں تارے ہنس رہے تھے۔ چاروں طرف نور کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ امرود کی پتیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ بدن انجانی لذت سے کانپ رہا تھا۔ ستارے اتنے قریب آگئے تھے کہ ہاتھ بڑھاتے ہی مٹھی میں آجاتے (ص ۱۴)

(۳) خوبصورتی نہ شام میں ہے نہ رات میں۔ خوبصورتی ہماری آنکھوں اور دل میں ہے۔ خالد نے کمرے کا تالا بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ تم اس چھت پر کھڑے ہو کر رات کا منظر دیکھو۔ سیاہ دوپٹے میں ٹنکے سلمی ستارے، زمین سے اٹھتا ہوا روشنی کا غبار، دلہن کی مانگ میں بھری افشاں کی طرح کہکشاں، سسکیاں بھرتی ہوئی ہوائیں اور چاند کی جدائی میں روتی ہوئی شبنم (ص ۸۷)

(۴) تمہاری آنکھوں کی کشش مجھے بے بس کر دیتی ہے خالد، میں چاہ کر بھی ان آنکھوں کا حکم نہیں ٹال سکتی۔ وہ جیسے پگھلی جارہی تھی، تم نے ان آنکھوں کو سحر کیسے سکھایا (۱۰۱)

(۵) آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے پہلی رات کا خواب یاد آیا۔ برف پوش پہاڑیاں، دودھیا روشنی

کا غبار، پھولوں کی وادی، چکراتی ہوئی خوشبو، خالد کی آنکھوں کا سحر اور اس کا دوزانو بیٹھنا۔ (ص ۱۴)

شفق کا یہ ناول کرداری نہیں۔ پھر بھی خالد، نعیم اور سلمیٰ کے کردار گہرا تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہے ہیں۔ دراصل یہ ایک موضوعاتی ناول ہے اور موضوع ہی اس کی طاقت ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ اردو کا پہلا ناول ہے لیکن چونکہ یہ ناول بہت عجلت میں لکھا گیا ہے اس لئے ناول کے مرکزی واقعے یعنی ۱۱ر ستمبر کے واقعات کو اس کے ذیلی قصے سے پورے طور پر نہیں جوڑا جا سکا اور فلمی انداز میں تمام کرداروں کو ملا کر روایت کے باسی پن کو برقرار رکھا گیا ہے جس سے ناول کے اختتام پر ہلکے پن کا احساس ہوتا ہے۔ پھر بھی خوف و دہشت کی فضا پورے ناول میں جاری و ساری ہے اور غالباً ناول نگار کا مقصد یہی ہے کہ آج مسلمانانِ عالم جس خوف و دہشت سے دوچار ہیں اس کی تصویر کشی کی جائے۔ اور ناول نگار اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نظر آتا ہے۔

ناول میں چند خامیاں بھی در آئی ہیں مثلاً قصہ ماہ ستمبر کا بیان ہو رہا ہے مگر ناول نگار ایک جگہ لکھتا ہے "پھر دسمبر کی یخ بستہ ہوا کمرے میں داخل ہوئی اور چاروں طرف گیندے کے پھول لہرانے لگے۔" (ص ۴۴)

اگر صرف دسمبر لکھا ہوتا تو سمجھا جاتا کہ یہ کتابت کی غلطی ہے مگر اس کے ساتھ "یخ بستہ ہوا" یہ ثابت کرتی ہے کہ ناول نگار کی ذہنی رو کے بھٹک جانے سے ایسا ہوا ہے۔ اسی طرح ناول نگار نے غیر اردو داں کرداروں سے خالص اردو کے مکالمے ادا کروائے ہیں جبکہ ناول کے دوسرے مقامات پر یہ کردار کھانٹی ہندی بولتے ہیں۔ مثلاً

(۱) "ملا عمر کی شامت آئی ہے جو امریکہ سے جرم کا ثبوت مانگ رہا ہے۔" (ص ۷۵)

(۲) "بہانہ - کیسا بہانہ۔ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسامہ نے ٹریڈ ٹاور پر حملہ نہیں کیا۔ امریکہ نے اپنی عمارتوں پر خود حملہ کر کے یہاں آنے کی راہ نکالی ہے۔ (ص ۷۶)

ان چھوٹی چھوٹی خامیوں کے باوجود شفق کا یہ ناول ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا کیوں کہ اس ناول کے ذریعہ شفق نے اپنے عہد کے ایک جلتے ہوئے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کی ایک اہم دستاویز ہے۔ موضوع کے ساتھ ناول میں نفسیاتی اور واقعاتی تجزیوں، تجسس اور اس کے فنی رکھ رکھاؤ میں ایسا اہتمام برتا گیا ہے کہ ایک بار شروع کر کے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہے گا۔

☆☆

اظہار اثر

نارودا پٹیا

دو روز سے جلے ہوئے مکانوں کے ملبے سے جلی اور ادھ جلی انسانی لاشیں نکال کر ہسپتالوں کے لاش گھروں کو بھیجی جارہی تھیں۔ علاقہ میں سو کے لگ بھگ مکان تھے، فساد کے دوران جن میں آگ لگادی گئی تھی۔ بہت سے مکان ادھ جلے رہ گئے تھے، زیادہ تر مکان اور دکانیں ملبے کا ڈھیر بن چکی تھیں۔ دو دن کی کوشش اور تلاش کے بعد گھروں اور سڑکوں پر پڑی یا ملبے میں دبی سبھی لاشیں نکال لی گئی تھیں۔

شام کا چار بجے کا وقت ہوگا اس لئے میں نے احتیاطاً پورے علاقے کا ایک چکر اور کاٹا تاکہ کوئی لاش دبی نہ رہ گئی ہو۔ لیکن وہاں بالکل سناٹا تھا۔ اب نہ وہاں فسادی تھے اور نہ فساد میں مرنے والے بدنصیب۔ میں ایک ٹوٹے ہوئے مکان کی طرف سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے میرے قدم روک دیے۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ کوئی گارہا تھا۔ میں نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ دو مکان ملبہ کا ڈھیر ہو چکے تھے ان مکانوں کے ملبوں کے درمیان ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آرہا تھا۔ آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔ میں آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا تو آواز کچھ صاف سنائی دینے لگی اس کا مطلب تھا اس مکان میں کوئی زندہ شخص تھا۔

"مگر وہ گا کیوں رہا ہے؟ میرے ذہن میں سوال اٹھا۔ یہاں تو کئی دن سے چیخوں، آہوں اور رونے کی آوازوں کے سوا کوئی آواز نہیں گونجتی تھی — ؟

میں دروازے کے اور قریب ہوا تو گانے کے بول کچھ سمجھ میں آئے۔ وہ کسی بچے کو لوری دے کر سلانے جیسی آواز تھی — الفاظ کسی گیت کے نہیں تھے مگر وہ ہر لفظ کو گانے کے انداز میں مدھم سر میں ادا کر رہا تھا۔ آواز رک رک کر آرہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

نہیں۔ نہیں۔ تجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں

میرے بچے

میں تجھے بھوکا نہیں مرنے دوں گا

تو ضرور اپنی ماں کا دودھ پیئے گا۔

تو فکر نہ کر۔ جب تو پیدا ہو کر اس دنیا میں آئے گا تو دودھ سے بھرپور تیری ماں کی چھاتیاں تیرا انتظار کر رہی ہوں گی۔

یہ الفاظ اور جملے وہ توڑ توڑ کر، رک رک کر بول رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ گا رہا ہے یا اس کے ٹھہر ٹھہر کر بولنے کی وجہ سے وہ آواز لوری کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

میں آگے بڑھ کر دروازہ کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے بہت احتیاط برتنی پڑ رہی تھی کیوں کہ دروازہ کے آگے جلی ہوئی اینٹوں اور مختلف قسم کی چیزوں کا ڈھیر تھا۔

دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کا سہارا لے کر دروازے کے اندر گردن ڈال دی۔ ایک لمحہ کیلئے میرے دماغ اور جسم کو بجلی کا سا جھٹکا لگا اور میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے دیوار پر دونوں ہاتھ ٹکا دئے۔ اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا سارا ساز و سامان ٹوٹا اور بکھرا پڑا تھا۔ آدھا کمرہ جلا ہوا تھا لیکن اندر جو اصل منظر تھا وہ اس قدر بھیانک اور عجیب تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے میری آتما کی گہرائیوں میں پرچھائیاں سی اترتی چلی گئی ہوں۔

میں ایک پولیس انسپکٹر ہوں۔ سات سال سے پولیس فورس میں کام کر رہا ہوں۔ ملازمت کے اس مختصر سے عرصہ میں بڑے بڑے خطرناک مجرموں سے میں نے مقابلہ کیا ہے۔ کئی خطرناک مجرموں کو گولی بھی ماری ہے۔ بڑی بڑی ہیبتناک لاشیں بھی دیکھی ہیں۔ ایسی عورتوں کی لاشیں جن کے ساتھ بہت سے مردوں نے پہلے بلاتکار کیا پھر ان کو قتل کر دیا۔ ایک تین سال کی بچی کی لاش دیکھ کر میں دو دن تک کھانا نہیں کھا سکا۔ ظالم مجرم نے اس بچی کے ساتھ بلاتکار کر کے اس کو لہولہان کر دیا تھا اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ ایک حاسد مرد نے اپنی بیوی کے پوشیدہ مقام میں چھری ڈال کر اس کا پیٹ تک چیر دیا کیوں کہ اس کو شک ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے مردوں سے بھی ناجائز تعلقات رکھتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میں نے طرح طرح کی خوفناک لاشیں دیکھی تھیں لیکن اس وقت جو منظر میرے سامنے تھا اس نے میری آتما کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ منظر بڑا عجیب اور انتہائی ہیبت ناک تھا— کمرے میں ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے درمیان ایک عورت کی ننگی لاش پڑی تھی جہاں سے میں دیکھ رہا تھا اس کی دونوں ٹانگیں پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ رانوں کے درمیان بدن سوج گیا تھا اور اس پر خون کے لوتھڑے سے جم گئے تھے۔ عورت کا پیٹ کچھ پھولا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کم از کم چار پانچ ماہ کے حمل سے تھی۔ لیکن اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے بیچوں بیچ ایک خنجر گھسا ہوا تھا۔ خنجر کا صرف دستہ نظر آرہا تھا۔ خنجر کا پھل یقیناً پیٹ کے اندر بچے کو بیندھ کر گزر گیا ہوگا۔

یہ منظر خود اپنے آپ میں دل دہلا دینے والا تھا لیکن اس سے بھی عجیب منظر یہ تھا کہ تیس پینتیس سال کے ایک مرد نے مردہ عورت کا سر اپنی ایک ران پر رکھا ہوا تھا۔ مرد کے سر میں کنپٹی سے سر کے پچھلے حصے تک ایک گھاؤ کھلا ہوا تھا اس پر بھی خون جما ہوا تھا۔ میں حیران تھا کہ سر پر اتنا بڑا گھاؤ کھانے کے بعد وہ زندہ کیسے رہ گیا تھا۔

تیسرا منظر اس سے بھی زیادہ عجیب تھا۔ عورت کی دونوں چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ زندگی میں اس عورت کی چھاتیاں بالکل گول اور سڈول ہوں گی۔ اب کٹ جانے کے بعد پھول کی طرح مرجھائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کی ایک کٹی ہوئی چھاتی چھرے کے دستے کے پاس اس کے پیٹ پر رکھی ہوئی تھی اور دوسری چھاتی سینے پر اس جگہ رکھی تھی جہاں سے اس کو کاٹا گیا تھا۔ مرد کے ہاتھ میں ایک بڑی سی سوئی تھی۔ جس میں دھاگا پڑا تھا اور وہ سر جھکائے بڑے انہماک سے کٹی ہوئی چھاتی کو اس کی جگہ لگا کر سی رہا تھا۔ آدھی سے زیادہ چھاتی کو وہ مردہ جسم پر سی چکا تھا۔ جب بھی وہ کھال میں سوئی گھسا کر ڈورے کو کھینچتا تو گانے کے انداز میں بڑبڑاتا۔

”بس میرے بچے بس، اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں دونوں چھاتیاں سی دوں گا۔ آخر میں ٹیلر ماسٹر ہوں۔ چھاتیاں سینے کے بعد ان میں دودھ بھر جائے گا پیدا ہونے کے بعد جسے تو پی سکے گا۔“

کچھ دیر وہ ہولناک منظر دیکھنے کے بعد اس کے کچھ بے ربط جملے سننے کے بعد کہانی کچھ کچھ میری سمجھ میں آچکی تھی۔ وہ شخص ٹیلر ماسٹر تھا وہ اور اس کی جوان اور خوبصورت بیوی اسی کمرے میں رہتے ہونگے کہ انسان کے بھیس میں شیطانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ عورت خوبصورت تھی اس لئے اسے مارنے یا جلانے سے پہلے اس کا انہوں نے اس کے ساتھ بلاتکار شروع کر دیا۔ اس کا شوہر بیوی کا بلاتکار ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ فسادیوں نے شاید جان کر اس کے شوہر کو نہیں مارا تھا تاکہ وہ فسادیوں کی بہادری

اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔ شوہر غصہ اور صدمہ سے پاگل ہو گیا تھااور فسادیوں کے قبضے سے نکل کر بیوی کو بچانے کی کوشش کرنے لگا ہو گا۔ اس وقت تب کسی فسادی نے اس پر خنجر سے وار کیا ہو گا۔ خنجر کنپٹی کو چیرتا ہوا دماغ کو یا صرف سر کو پھاڑتے ہوئے گزر گیا تھا جس کی وجہ سے وہ بے جان ہو کر گر پڑا ہو گا۔ فسادیوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ وہ مر گیا اور بلاتکار کے بعد وہ دونوں کو مردہ سمجھ کر چھوڑ کر کسی دوسرے شکار کی تلاش میں چلے گئے ہوں گے۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یقیناً وہ شخص چوٹ اور صدمہ سے پاگل ہو چکا تھا کیوں کہ اسے ذرا سا بھی احساس نہیں تھا کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور اس کے پیٹ میں بچہ بھی مر چکا ہے۔ بیوی کی کٹی ہوئی چھیاتیاں دیکھ کر اس کے پاگل دماغ نے سوچا ہو گا کہ اس کٹی ہوئی چھاتیوں سے اس کا ہونے والا بچہ دودھ کیسے پیے گا۔ وہ چونکہ ٹیلر ماسٹر تھا اس لئے اس نے سوچا ہو گا کہ وہ چھاتیوں کو ان کی جگہ سی دے گا تو ان میں دودھ بھر جائے گا جن سے اس کا ہونے والا بچہ اپنا پیٹ بھر سکے گا۔

یہ کہانی اگرچہ میں نے واقعات کے جوڑ ملا کر سوچی تھی جو عقلی طور پر درست لگتی تھی۔ پھر میں نے سوچا عورت کو مرے چوبیس گھنٹوں سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں اور یہ شخص جو صدمہ سے پاگل ہو چکا ہے یہ بھی سر کے زخم کے باعث کسی بھی وقت مر سکتا ہے اس وقت وہ اپنے ہوش وحواس میں بالکل نہیں تھا اس لئے میں نے دیوار کو مضبوطی سے تھاما اور کھلے ہوئے دروازہ سے بمشکل اندر داخل ہو گیا۔ میرے اندر داخل ہونے کی آواز پر وہ چونکا تک نہیں بلکہ اس نے میری طرف سر بھی اٹھا کر نہیں دیکھا۔ میں چند لمحے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر میں نے نرم لہجے میں کہا:

"بھائی کیا کر رہے ہو—"

میری آواز سن کر بھی اس نے سر اٹھا کر مجھے نہیں دیکھا۔ اسی طرح سر جھکائے جھکائے بولا

"دیکھ نہیں رہے، میں اپنی بیوی کی کٹی ہوئی چھاتیاں سی رہا ہوں۔ ہمارا بچہ اس دنیا میں آنے والا ہے اگر چھاتیاں نہ ہوں گی تو وہ دودھ کیسے پیے گا۔"

میں نے اپنی بھرائی ہوئی آواز پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا

"تمہارا بچہ کب تک آنے والا ہے"

"مجھے تو پتہ نہیں۔" پہلی بار اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی ایک ہفتہ پہلے جب میں بستر پر لیٹا اپنی بیوی سے باتیں کر رہا تھا اور اس کی گول گول ٹھوس چھاتیوں سے کھیل رہا تھا تو اس نے کہا تھا

"اور کچھ روز کی بات ہے تم میری چھاتیوں کو چھولو۔ کچھ دن بعد تو میں تمہیں انکو ہاتھ بھی نہیں لگانے دوں گی۔
میں نے حیرت سے کہا — کیوں کیا تم مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ کچھ دن بعد تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو گی۔

اس پر اس نے میرے گال سے چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا — "تم بھی کیسے بدھو مرد ہو، تمہیں معلوم ہے ہمارے گھر تیسرا مہمان آنے والا ہے، یعنی ہمارا پہلا بچہ! وہ آجائے گا تو ان چھاتیوں کا مالک وہ ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس کے آنے کے بعد ان میں دودھ بھر جائے گا۔ کیا تم اپنے بچے کے ساتھ میرا دودھ پیو گے۔ یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسی تھی۔

میں اس کی دماغی حالت کو سمجھ رہا تھا، اس لئے میں نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا

"اگر تم چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں"

"کیسے —" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا — "کیا تم میری بیوی کی کٹی ہوئی چھاتیاں جوڑ سکتے ہو"

"ہاں، جوڑ سکتا ہوں۔" — میں نے کہا

"تو جوڑ دو" — اس نے سوئی دھاگا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"اس کے لئے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا"

"کہاں"

"میرا ایک دوست یہی کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی دوا ہے جو ہر کٹی ہوئی چیز کو جوڑ دیتی ہے۔"

پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی کی لہر ابھری۔ اس نے کہا

"تو مجھے اپنے اس دوست کے پاس لے چلو" —

میں جانتا تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا لیکن اس بد نصیب آدمی کو ذرا سے جھوٹ سے راحت مل سکتی تھی تو ایسا جھوٹ گناہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

"تم اسی طرح بیٹھے رہو۔ تمہاری بیوی سو رہی ہے۔ میں گاڑی منگاتا ہوں اس میں تم اپنی بیوی کو لے چلنا۔"

"اچھا —" اس نے سر ہلا کر کہا — "میں بیٹھا ہوں، تم گاڑی منگالو۔"

میں نے وہاں سے اٹھ کر اپنے موبائل پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کیا اور فوراً ایمبولنس بھیجنے کو کہا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی ایمبولنس آگئی۔ پہلے میں نے عورت کی لاش کو ایمبولنس میں رکھوایا اس کے بعد اس کے شوہر کو ساتھ لے کر بیٹھ گیا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد میں نے اس شخص سے کہا

"تمہاری بیوی کے لئے ایک کمرہ تیار کرا دیا گیا ہے۔ اس کو کمرے میں لے جا کر اس کی چھاتیاں جوڑنے کا کام شروع

ہو جائے گا۔ تم یہیں میرے پاس بیٹھے رہنا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم تمہاری بیوی سے ملنے چلیں گے۔"
وہ راضی ہو گیا۔

مردہ عورت کی لاش ہسپتال کے آدمی اٹھا کر لے گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا وہ گاڑی کو پاگل خانے لے چلے۔ مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس کا پاگل پن ٹھیک ہونے والا نہیں، کیوں کہ جن حالات سے وہ گزرا ہے، ان حالات میں کوئی انسان اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہ سکتا۔ دوسرے مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس کے سر کا خطرناک زخم بھی اس کی زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوگا۔ چنانچہ میں اس سے پیار سے باتیں کرتا، اس کی بیوی کے بارے میں پوچھتا پاگل خانے میں لے گیا اور اس کو ڈاکٹروں کے حوالے کر کے واپس آ گیا۔ لیکن دو گھنٹے بعد ہی پتہ چلا کہ وہ مریض مر گیا ہے۔

نارواپٹیا کے علاقہ میں فسادات کا خونی واقعہ پیش آنے کے ایک ہفتہ بعد احمد آباد کے ایک اخبار میں خبر چھپی
"انسپکٹر واگلے نے بڑی عجیب وجہ بتاتے ہوئے پولس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ انسپکٹر واگلے نے اپنے استعفیٰ میں لکھا ہے کہ وہ ایسے محکمہ میں نوکری نہیں کر سکتا جس میں انسانیت پر عمل کرنے اور ملازمت سے متعلق اپنا فرض نبھانے پر روک لگا دی جائے۔

☆☆

حسین الحق

زخمی زخمہ

برسات کا غالباً آخری مہینہ تھا۔ نائپال کو نوبل پرائز ابھی نہیں ملا تھا ——

رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا جب غیب سے ایک شخص نمودار ہوا اور مجھ تک یہ پیغام پہنچایا کہ "ہوا لڑکھڑانے لگی ہے"۔ اس وقت محفل میں رقص کا سماں تھا اور شہ زیب خاں یوسف زئی موڈ میں تھا۔ اس کی پاٹ دار آواز محفل سے آگے دور دور تک قلانچیں بھر رہی تھی :

ہم فقیرے ہم شہ گردوں فرے

ارد شیرے باروان بوزرے

ایک پل کے لئے میرے جی میں یہ خواہش اپنے پورے سر جوش کے ساتھ سر اٹھاتی ہوئی محسوس ہوئی کہ میں شہ زیب خاں تک بھی یہ پیغام پہنچا دوں مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اس پل میں ایک ناچتی گاتی موج کا استعارہ ہے۔

برسات کا غالباً آخری مہینہ تھا، بارش نہ ہونے سے سارا دن تپتے سلگتے گزرتا تھا اور رات میں ہوا بند ہو جاتی تو سارے کی ساری فضا امس میں گھر جاتی.......... وہ رات تو یوں بھی دھویں اور گرد و غبار سے اٹی پڑی تھی، کیوں کہ اس رات سے پہلے والا دن.......... "

ہندوستانی وقت کے مطابق نو بجے کے آس پاس.......... تھوڑے تھوڑے وقفے سے.......... "

محفل میں جشن کا سماں تھا اور شہ زیب خاں یوسف زئی موڈ میں تھا۔

یہ شہ زیب خاں یوسف زئی بھی عجیب قسم کا کردار ہے، باپ دادے اس کے نخالص افغان، جو کسی غلام کی طرح کڑی محنت کر کے روزی حاصل کرنا اپنے لئے باعث شرم سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں

اس سے زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ خون میں لت پت ہو کر اپنے لئے کچھ حاصل کر لے، جنگ کے میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جانا انتہائی ذلیل حرکت سمجھتا ہے لڑنا اس کی تفریح ہے۔ تین وقت کا کھانا ایک وقت میں کھا سکتا ہے اور تین دنوں سے زیادہ بھوکا رہ کر دھواں دھار جنگ لڑ سکتا ہے۔ ایسے نخالص سے میرا سامنا تھا اور وہ نخالص موڈ میں تھا —— من حضور آں شہ والا گہر بے نوا مردے، بہ دربار عمر۔ میں کانپ اٹھا .... پروردگار! اس کی بے خودی تو اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے!

پھر ایک جھماکا سا ہوا .... ہندوستانی وقت کے مطابق نو بجے کے آس پاس ...."

مجھے لگا، میں کسی بے آب وگیاہ جنگل میں، یا کسی اق ودق صحرا میں چلتے چلتے تھک کر بس اب گرنے والا ہوں .... "العطش، العطش .... مگر میری چیخ سننے والا شاید کوئی نہیں ...... تا حد نظر بس ایک جلتا سلگتا صحرا .... دونوں عمارتوں میں تقریبا .... "میں نے محسوس کیا، میں اس محفل میں کہیں نہیں تھا، جہاں شہ زیب خاں یوسف زئی نغمہ سرا تھا

خیز وازوے شعلہ ہائے سینہ سوز

با مزاج تو نمی سازد ہنوز

میں ۱۳ھ میں عبداللہ بن عامر حاکم بصرہ کے پاس تھا۔

عبداللہ بن عامر خلیفہ ثالث کی طرف سے خراسان کی فتح کے واسطے مقرر ہوئے، عبداللہ نے کچھ ہی دنوں میں بڑی بڑی فتحیں حاصل کیں۔ پھر عبداللہ کے بیٹے خالد کو ہرات غور اور غرجستان کی ولایت سپرد کی گئی۔ تذکروں اور تاریخوں میں مذکور ہے کہ خالد بن عبداللہ خالد بن ولید کی نسل سے تھا...... میں مدتوں عبداللہ بن عامر اور اس کے بیٹے خالد بن عبداللہ کے ساتھ رہا۔ ان دنوں بھی جب ہرات اور نمود سے کابل تک سرپٹ گھوڑا دوڑاتا چلا جاتا تھا اور لوگ احترام میں اپنی ٹوپیاں اتارتے چلے جاتے تھے، اور ان دنوں بھی جب اسے کابل کی حکومت سے معزول کیا گیا۔

یہ معزولی اسے بہت شاق گزری اور دوبارہ عراق وعرب کی طرف مراجعت دشوار جان کر، حاکم جدید کے خوف سے مع عیال واطفال، اعیان کابل کی ہدایت سے کوہ سلمان پر کہ ملتان اور پشاور کے مابین واقع ہے، جا کر متوطن ہوا، اور اپنی بیٹی ایک افغان معتبر کے حبالہ نکاح میں لایا اور اس لڑکی سے اولاد بہت ہوئی۔

"اس کا مطلب یہ کہ باپ افغانی ماں عرب۔" ایک عزیز نے تبصرہ کیا

اس پر دوسرا عزیز بولا : "سونے پر سہاگہ"

"نہیں"۔ پہلے نے دوسرے کو کاٹا : "مطلب یہ کہ افغانیوں کے معاملات میں عرب پہلی صدی ہجری سے ہی دخیل ہو گئے۔"

میں نے خود پر قدغن لگانی چاہی۔ "یہ احتساب کا نہیں جشن کا لمحہ ہے۔"

مجھے اخبارات کی سرخیاں یاد آ گئیں...... اسے ڈھول چٹادی گئی...... بادشاہ سلامت کہیں چھپ گئے......

تجارت اور دفاع پر گہری چوٹ تیس مار خاں کی تو ہوا نکل گئی...... یہ خوف اور بے خوفی کی جنگ ہے......"

کتاب کے اوراق پھڑ پھڑائے...... "فتح ملے تو دینے والے کی بڑائی بیان کر، اور اپنی خامیوں کو اپنی خوبیوں سے ڈھانپ!"

شہ زیب خاں یوسف زئی جامے سے باہر ہوا جارہا تھا...... یہ علاقہ ان کا قبرستان بنے گا"

میں چپکا بیٹھا سارا کچھ دیکھتا رہا کہ میرے بس میں اور تھا ہی کیا۔ میری حالت تو اس قیدی کی ہو گئی تھی جسے کسی کھمبے سے باندھ کر اس کے سامنے اس کے مکان کے منبر و محراب ہی نہیں، مکان کی بنیاد ہی کھود کھود کر نکال پھینکی جا رہی ہو۔

☆

خبر تو ۱۱ر دسمبر کو دن میں بارہ بجے کے آس پاس ہی مل گئی تھی۔

میں اس وقت علی گڑھ میں "باب سید" سے ہو کر مولانا آزاد لائبریری کی طرف آ رہا تھا۔

دو لڑکے بات کرتے ہوئے گزرے : ہندوستانی وقت کے مطابق نو بجے کے آس پاس تھوڑے وقفے سے دونوں......"

دوسرا لڑکا بتا رہا تھا : دونوں عمارتوں میں تقریبا......"

میں سر سید ہاؤس کے پاس رک گیا، دروازے پر دستک دی تو مولوی الطاف حسین حالی گلے میں سوتی مفلر لپیٹے باہر نکلے اور مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں بیک وقت گریہ اور تبسم دونوں کے زیر دام آیا کہ ان میں کون میرا استعارہ تھا کون میرے ارد گرد پھیلی خلق خدا کا مجھے پتہ نہیں تھا۔ میں تو سید کی جناب میں صرف عرض گزارنے آیا تھا کہ زوال آدم خاکی......"

"سید صاحب تو نہیں ہیں۔"

میری متحیر نگاہیں شاید حالی نے پڑھ لیں۔ وہ آہستہ سے بولے : امریکی حکومت نے سید صاحب کا ویزا ضبط کر

لیا ہے"

میں مایوس ہو کر لوٹنے لگا تو حالی نے کہا: "ایک منٹ رکو"۔ اور اندر چلے گئے۔ پھر اندر سے ایک کاغذ لئے بر آمد ہوئے اور مجھے دیتے ہوئے کہا: سید صاحب نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ۱۱ر ستمبر کو کوئی مجھے پوچھنے آئے تو اسے یہ کاغذ دے دینا۔"

"تو آج میرے علاوہ کوئی نہیں آیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا تو حالی ہنس دئے اور بولے...... نہیں"

پھر ذرا رک کر بولے، بالکل سرگوشی کے انداز میں کہا: "آج کوئی ادھر کیوں آتا؟ آج تو سب کا رخ تھیولوجی ڈپارٹمنٹ کی طرف ہے۔"

میں اس بات پر کیا کہتا۔ چپکے سے سرسید کا نوشتہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھام لیا، اور اپنے ارد گرد نگاہ کی، آسمان پر لال بھبھوکا سورج آگ برسا رہا تھا اور ۱۱ر ستمبر کی چلچلاتی ہوئی نم دوپہر میں حالی روڈ شبلی روڈ سب دھڑ دھڑ جل رہے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری سے امریکی جہاز ٹکرا چکا تھا اور ٹھاکر پونچھی کا ای میل مجھ تک پہنچنے کی راہ میں تھا کہ پونچھ، بارہ مولا، سری نگر اور جموں...... سارے کا سارا آسمان جنگی طیاروں سے اٹا پڑا ہے۔

اسی درمیان شہ زیب خاں یوسف زئی کی پاٹ دار آواز پھر سنائی دی۔

خیز دازوئے شعلہ ہائے سینہ سوز

میں نے ادبدا کر حالی کے آگے ہاتھ جوڑ لئے۔ خدا کے لئے شاعری کو قید سے رہائی دلوائیے...... اس وقت اور کوئی حربہ کارگر ہونے والا نہیں۔ تو حالی ایک خاص ادا سے مسکرائے اور بولے۔ "جب نظریات کی دیوار بلند ہو جاتی ہے تو قید شاعری کی تقدیر بن جاتی ہے۔"

میں بے چینی کے عالم میں آگے بڑھ گیا...... حالی روڈ سے یونیورسیٹی روڈ پر آ چکا تھا، اور چپ چاپ چلا جا رہا تھا مگر اندر اندر...... کسی کونے کھدرے میں...... ایک عجیب سی اداسی لکل مارے بیٹھی تھی...... پس منظر میں آواز گونج رہی تھی...... جو ابر یہاں سے اٹھا ہے وہ سارے جہاں پر برسا ہے...... اور سامنے شاعری کا جھلسا ہوا لاشہ سر سید ہاؤس اور یونیورسیٹی قبرستان کے بیچوں بیچ بے کفن پڑا تھا...... اور مولانا آزاد لائبریری کے سامنے والی سڑک پر گدھوں کا جھنڈ کا جھنڈ منڈلا رہا تھا۔

خاصا خوفناک تھا یہ تصور، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور تب اچانک اسی پل میں کسی انجانی سمت سے خواجہ حسن نظامی پورم پور میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور بہت افسردہ لہجے میں میرے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر کہا: "چشتی زادے! لاش نوچنے والے یہ گدھ تمہیں اب نظر آئے ہیں؟"

میں نے ان سے آنکھیں چرانے کی کوشش کی، اور کیا کرتا؟ تقریباً سو برسوں سے تو میں پروپیگنڈہ رینج میں ہوں، جب ایک ضعیف خاتون کو، صرف تک بندی پر، مائیں اور بیٹیاں اپنے کانوں کا جھومر اور ہاتھوں کا کنگن چندے میں دینے لگیں، اور جب ایک بڈھے بڈھی کا جھگڑا قوم کی عزت اور ذلت کا سبب بن جائے اور جب دوسرے ملک پر غاصبانہ قبضہ کرنے والا قوم کا ہیرو بن جائے تو پھر سمندر پر بندھ باندھنے کا یارا کس کو رہتا ہے؟

"آپ صرف سو برس کی بات کیوں کرتے ہیں۔ ہم جس ملائیت اور فسطائیت کا شکار ہیں، یہ تو غزالی کی دین ہے۔"

"پیارے۔ اب تم نیا لفرامت کھڑا کرو۔ ابھی سو برس کا حساب تو کر لینے دو۔" میں نے ساجد کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

"اب سو برس کے حساب سے کام نہیں چلے گا"۔ ساجد کی حمایت میں ناصر کھڑے ہو گئے۔ بے شک غزالی ہمارے درمیان عقل دشمن تحریک کے موجد ہیں۔"

"نیا ورق" اور "بادبان" کے اوراق فضاؤں میں پھڑپھڑا رہے تھے اور میں بھاگ رہا تھا...... میرا رخ سیدھے سیدھ اس طرف تھا جہاں ہندوستانی وقت کے مطابق نو بجے کے آس پاس......"

مگر اچانک بیچ راہ میں احساس ہوا کہ ...... چاروں طرف خنزیروں کی فوج جمع ہے، اور ہر چہار اطراف ایک خارش زدہ جھبرا کتا دوڑ رہا ہے...... اور مرشد کا سوال اب تک اپنی جگہ پر قائم ہے: "فرزند بتا! غیر کون ہے؟"

نواکھائی، مائی لائی اور العریش سے ہندوستانی پارلیامنٹ تک...... فرزند غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے۔؟

میرا مغز شاید کسی بوائلنگ فرنیس میں ڈال دیا گیا ہے، سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت مفقود ہو گئی ہے، بس ایک آگ ہے جو کاسہ مغز میں تیزی کے ساتھ پھیلتی جا رہی ہے۔ سارا کچھ آگ کے شعلوں کی زد پر ہے۔ اسی آگ کے شعلوں کی روشنی میں ایک اور تحریر جھلملاتی ہے:

"جلاوطن کر دیے جانے والے نے سمجھا مگر آپ نہ سمجھے، کر دیا بے چارے کو جلاوطن، خون منھ کو لگا ہوا تھا نا؟ اور اس پر کرسی نشیں کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا، بات مذہب کی قطعی نہیں تھی، سارا مسئلہ معاشی تھا مگر ایسا چکر چلا کہ سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا......
ملوکیت کی ابتدا سے ملوکیت کی انتہا تک تمہاری نس نس میں جو زہر سرایت کر گیا ہے وہ

اب دوسروں کے لئے نہیں تمہارے ہی لئے قاتل بن رہا ہے...... انجیر کے درخت میں پھل آتے آتے مدتیں گزر جاتی ہیں۔ صدیوں پہلے جو کچھ ہوا اس کا اصل نتیجہ تو اب ظاہر ہو رہا ہے۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم تو بیج کی کڑی تھے...... ہتھیار ڈالنا تمہاری تقدیر ہے، خواہ اس تقدیر تک پہنچنے کی مدت کو تم کھینچ تان کر کتنی ہی طویل کیوں نہ کر لو...... مگر حقیقی صورت حال یہی ہے کہ چہار دانگ عالم میں ایک خارش زدہ جھبرا کتا دوڑ رہا ہے اور اس کے لعاب کو لوگ آب حیات سمجھ کر شیشیوں میں جمع کر رہے ہیں۔"

اب سمجھ میں آرہا ہے کہ تغلق سلاطین سے چشتیوں کا نباہ کیوں نہ ہو سکا۔

یاد آیا، دولڑکے بات کرتے ہوئے گزرے تھے...... ایک دوسرے کو بتا رہا تھا "تیس مار خاں کی تو ہوا نکل گئی۔"

اور وہ جو دونوں عمارتوں میں؟

"کریما، داورا! پروردگار! انسان کا انسان سے اب کوئی تعلق باقی نہیں بچا؟"

میں نرخرے کی پوری طاقت سے چیخ رہا تھا اور بھری پری سڑک پر کوئی نہیں تھا، مجھے لگا میں یونیورسیٹی روڈ پر نہیں کسی بے آب و گیاہ جنگل یا کسی لق و دق صحرا میں چلتے چلتے تھک کر بس اب گرنے والا ہوں۔ اور تب ایسے ہی سفاک پل میں راہی معصوم رضا نے مجھے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور بڑی نرمی سے بولے: "اس نے وعدہ کیا ہے ملنے کا"

میں راہی کا ہاتھ پکڑ کر پھپھک کر رویا...... اس انتظار میں تو آپ بھی بیت گئے اور میں بھی بیتنے کی کگار پر آن کھڑا ہوا، کتنی صبحیں انتظار کی بھٹی میں جل کر راکھ ہو گئیں، کتنی شامیں جلتی سلگتی دوپہر بنیں اور کتنی راتیں آنسوؤں میں بہہ گئیں پر انتظار تو نہ ختم ہوا، یہ کیسی ملن کی آس ہے جس میں جسم راکھ ہو جاتا ہے اور ملن کی بیلا نہیں آپاتی، ان کیمن ہٹ ماروں نے راستہ کتنا مشکل کر دیا...... نیل کے گنگناتے ساحل سے / سیب انگور کے شگوفوں تک / نیو پارک کی فضاؤں میں / شام پیرس کی شاہراہوں میں...... ہٹ ماء اب کہاں نہیں؟

راہی پھر مسکرائے اور دھیرے سے بولے: اب ملاقات کی کوئی سبیل نہیں۔ یہ تو شاید گوتم کے بھی اٹھا لینے کا وقت ہے!"

میں راہی کا ہاتھ پکڑ کر پھپھک پھپھک کر رویا، میں روتا رہا مگر راہی رکے نہیں، میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے آگے بڑھ گئے...... اس نے وعدہ کیا ہے ملنے کا......"

راہی کی آواز وقت کے جھٹپٹے میں رل مل کر ان دیکھی اور ان سنی محسوس ہوتی ہوئی...... اور میرے ہاتھ میں حالی کے ذریعہ ملا ہوا سر سید کا ان پڑھا ہوا نوشتہ......جی میں کھدبد ہونے لگی "سر سید نے پیغام بھجوایا ہے"...... خیال آیا، اب تو رات آن کھڑی ہوئی۔ اس اندھیرے میں کیا دکھے گا؟ مگر سر سید نے آخر وہ پیغام مجھے کیوں بھجوایا؟ میں ابھی اس دوبدھے سے باہر بھی نہیں نکل پایا تھا کہ شہ زیب خاں یوسف زئی کی دہاڑ سنائی دی۔

"خوچہ کافر کا بچہ...... جشن کے لمحے میں روتا ہے؟"

اور تب یوں ہوا کہ میں ہنستا بھی تھا اور روتا بھی تھا اور شہ زیب خاں یوسف زئی جھوم جھوم کے کھونٹ کھونٹ ناچتا تھا...... کینیا اور تنزانیہ سے نیویارک تک...... کابل سے دہلی تک...... خیز دازوے شعلہ ہائے سینہ سوز!

میں شہ زیب خاں کے ڈر سے چپکا بیٹھا رہا، شہ زیب تال بے تال ناچے جا رہا تھا، اور عبد اللہ سرائے میری مجھے سمجھائے جا رہا تھا: "یہ سب الزام ہے، میڈیا ان کے قبضے میں ہے، جو چاہیں کہیں، مگر ہماری کتابوں میں اس کا جواز نہیں۔"

غصے کی شدت سے میرے کانوں کی لویں گرم ہونے لگیں، یہ ساری دنیا کو بے وقوف کیوں سمجھتا ہے؟ جب خود کچھ کرنا چاہتا ہے تو کتاب کو کنارے رکھ دیتا ہے اور جب اس کے کئے پر ہاہاکار مچتی ہے تو کتاب کی آڑ لینے لگتا ہے۔

"بزدل...... چور"۔ اندر اندر غلاظت معدے سے حلق تک دوڑتی محسوس ہوئی، لگا قئے ہو جائے گی، پھر یاد آیا۔ یہ میرے چپ رہنے اور عبد اللہ سرائے میری کے بولنے کی گھڑی ہے۔ یاد یہ بھی آیا کہ اس سال ۶/دسمبر چپ چاپ گزر گیا...... ۶/دسمبر سے ۱۵/مارچ اور ۱۵/مارچ سے ۲۷/فروری کے درمیان......؟

میں نے سر جھٹکا۔ ایک یہی لفڑا نٹا کیا کم ہے؟ شہ زیب خاں یوسف زئی تو جی کا جنجال بنا ہی ہوا ہے، اب اس میں ایک اور نیا پہلو پیدا کر کے کیا ملے گا؟ یاد آیا کہ شہ زیب خاں یوسف زئی کو ابھی تک ہوا کی لڑکھڑاہٹ کا اندازہ نہیں ہو سکا ہے، وہ اپنی دنیا میں گم، اپنی بنائی چہار دیواری میں اپنی کھڑی کی ہوئی قید کا قیدی، گزرے موسموں کی خوشبوؤں میں گم، جسے پتا نہیں کہ ہوا صرف بادام اور افیون کے درختوں سے ملن کا کھیل نہیں کھیلتی...... ہوا / بے نیاز ماد تو گھومتی ہے / سفر کے وسیلے / خطر گھولتی ہے / لہو رولتی

ہے......"

رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا جب غیب سے ایک شخص نمودار ہوا اور مجھ تک پیغام پہنچایا: "ہوا لڑکھڑانے لگی ہے!"

پھر دریائے ڈینیوب سے دریائے نیل تک، آمیزن سے گنگا اور راوی تک، ایک گھمسان کا بے آواز رن پڑا، شہ زیب خاں یوسف زئی جھوم جھوم کر ناچتا رہا اور ہوا آہستہ آہستہ اپنا دامن کھینچتی رہی...... پھر ایک پل وہ آیا جب شہ زیب کے آس پاس سانس لینے کے لئے بھی ہوا نہیں بچی۔

گھروں گلیاروں، محلوں سڑکوں، شاہراہوں، شہروں اور ملکوں ملکوں ایسی ہاہاکار مچی جس میں سب جل گیا۔ میں پہلے ہی شہ زیب کو سمجھانا چاہتا تھا کہ سیادت وقیادت اور حسن وطاقت پہ کسی کا اجارہ نہیں، تو اگر اس کا دعویٰ دار ہے تو تیرا دعویٰ بھی پوچ اور ڈینیوب وٹیم کے ساحلوں پہ اگر کوئی سوانگ رچ رہا ہے تو اس کی ہانڈی بھی بیچ چوراہے پر پھوٹے گی۔ مگر آدمی کی اولاد کا سب سے بڑا المیہ تو یہی ہے کہ جب وہ بے زین کے گھوڑے پر اچھل کر سوار ہو جاتا ہے اور درّانا دوڑتا ہوا کوہ ومیدان اور وادی وصحرا فتح کرتا آگے بڑھتا ہے تو بھول جاتا ہے کہ اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں چاروں طرف اٹھتی ہوس کی تیز آندھی میں اس کا اپنا سراپا چھپتا چلا جارہا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے یا اسے بھلانے کی عادت دلا دی جاتی ہے کہ کسی کے ہاتھ کی سرحد وہیں تک ہے جہاں سے کسی کی ناک کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ شہ زیب خاں یوسف زئی جب تک دوسروں کی ناک کا نشانہ لیتا رہا اسے بہت اچھا لگتا رہا مگر جب ہوا لڑکھڑائی اور فضا میں ایک ہاتھ بلند ہوا۔ اور اس بلند وبالا ہاتھ نے شہ زیب کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ بلبلا اٹھا...... خوچہ، کافر کا بچہ!"

اس کی نظر میں سب کافر تھے۔ اس کے اپنے عم زاد بھی اور اس کے ہم سائے بھی...... شہ زیب خاں کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ وہ صرف فیصلے سنانا جانتا ہے، وہ بس اپنی کہتا ہے، دوسرے کی نہیں سنتا...... خوچہ کافر کی بات مت سنو، گمراہ ہو جاؤ گے۔"

"شہ زیب خاں، بات کو سمجھو، یہ کفر نہیں، کتاب میں کہیں نہیں لکھا ہے کہ اسکول ہسپتال بند کرا کے ہتھیار خریدے جائیں۔"

میں شہ زیب خاں کو سمجھانا چاہتا تھا مگر شہ زیب خاں تو جادو کے حصار میں تھا۔ اور شہ زیب ہی کیا، شہ زیب سے سرائے میری تک...... سب کالے جادو کی قید میں ہیں۔ سفلی عمل جس میں گندگی کا اوڑھنا ضروری بھی ہو جاتا ہے۔

فضا میں ایک ہاتھ نے جب بلند ہو کر شہ زیب کا ہاتھ پکڑا تو وہ غصے سے ناچ ناچ گیا، مگر شہ زیب

کے تال بے تال رقص کو تو اب رکنا ہی تھا، سو رقص رک چکا ہے، رات جوں کی توں اپنا تنبو تانے کھڑی ہے، اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ آدم زاد نہیں کچھ ہیولے سے دائیں بائیں ڈولتے نظر آرہے ہیں...... نورالدین سہارن پوری کہتا ہے...... جہاں میں اہل ایماں......"

مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ اسے یہ کیوں نہیں یاد...... گاہے گاہے غلط آہنگ بھی......"

جب عہد نامہ برلن پر دستخط کی جارہی تھی اس وقت بھی ہوا کے کاندھے پہ اک پیغام آیا تھا......"

اب تو مرض کی تشخیص کرلو ...... پانچ سو سال کے بعد خلافت کا شوشہ چھوڑ کے کیا حاصل ہوگا۔"

اور وہی ہوا...... اورنگ زیب کی طرح صرف عبدالحمید ثانی...... باقی سب تو......"

خیر چھوڑیئے...... میں بھی یہ ایران توران کی بات کہاں لے بیٹھا...... مسئلہ تو اس محفل کا ہے جہاں شہ زیب خاں یوسف زئی نغمہ سرا تھا، اصل میں محفل تو بے در و دیوار کی جمی تھی، ہفت افلاک کے سائے تلے۔ اور ایک سے ایک حشرات الارض جمع ہو گئے تھے۔ ایسے میں کسی ایک کا نعرہ مستانہ کچھ دیر تک تو لوگ برداشت کرلیتے ہیں مگر یہ کچھ دیر بھی کتنی دیر؟

جب ہوا لڑکھڑانے لگی اور شہ زیب خاں یوسف زئی ہوا کی لڑکھڑاہٹ سے بے نیاز، اپنے آپ میں گم، اپنی دھن میں مگن اور اپنے خوابوں میں مست رہا تو پھر کسی سمت سے ایک شخص ڈرتے ڈرتے کھڑا ہوا...... حدیث عشق بہ اہل ہوس چہ می گوئی...... آس پاس والوں نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر زبردستی بٹھادیا: "اوئے خاں، تو نیا خرخشہ نہ کھڑا کر۔" لیکن اب خان آہستہ آہستہ ٹرانس میں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر کھڑا ہوا اور چیخا

بسے گزشت کہ در انتظار زخمہ وریست

چہ نغمہ ہا کہ زخوں شد بہ ساز افغانی

اور پھر یہ عجیب بات ہوئی کہ دور دور تک، کوہ در کوہ، غار در غار، وادی در وادی، ایک آواز بگولے کی طرح چکر کاٹتی رہی، صدائے گنبد کی طرح گونجتی رہی، تکرار کرتی رہی، سر پٹختی رہی...... بہ ساز افغانی ...... بہ ساز افغانی......"

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ رقص رک چکا ہے، رات ابھی تک جوں کا توں اپنا تنبو تانے کھڑی ہے۔ اندھیرے میں کچھ ہیولے دائیں بائیں ڈولتے نظر آرہے ہیں اور چاروں طرف ایک آواز کا Echo جاری ہے:

بہ سازِ افغانی......بہ سازِ افغانی......"

پندرہ سو برس میں ایک کوشش چوتھی مرتبہ......

کہیں یہ کوشش ہی تو......؟

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سوال جواب کی تلاش میں چاروں کھونٹ سر پٹختا پھر رہا ہے اور میرے ہاتھ میں سر سید کا پیغام ہنوز ان پڑھا موجود ہے ——!!

☆☆

مشرف عالم ذوقی

فریج میں عورت

(۱)

وہ چپ چپ اس بات کا اعتراف کر لیتا تھا۔ "ہاں، میرے فریج میں ایک عورت ہے۔"

—— فریج میں عورت؟

—— کیوں، عورت فریج میں نہیں ہو سکتی۔ میں جب چاہوں، اسے فریج سے باہر بلا لیتا ہوں کمرے میں یار، اس کے ساتھ ہنستا ہوں، باتیں کرتا ہوں، دل بہلاتا ہوں۔

• •

فریج والی عورت پہلی بار اس کے کمرے میں کب آئی یا اس کے کمرے نے پہلی بار فریج کا منہ کب دیکھا، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ممکن ہے آپ اس کہانی پر کچھ زیادہ یقین بھی نہ کریں، یا یہ کہانی آپ کو بے وقوفی سے بھری ہوئی ایک من گھڑنت کہانی نظر آئے۔ تسلیم، اس کے باوجود میں کہوں گا آپ اس کہانی کا مطالعہ ضرور کریں۔

بہار کے موتیہاری ضلع کے رہنے والے نربھے چودھری کو دلی میں جگہ کیا ملی قسمت کھل گئی۔ عام طور پر مہانگر میں آنے کے بعد آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ مگر نربھے چودھری کا رویہ دوسرا تھا۔

"کاہے، موتیہاری اب کم ہے کا۔ ارے اب یہاں بھی شوٹنگ ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ہیرو ہیروئن آتے ہیں۔"

ان دنوں موتیہاری میں شول فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی اور نربھے چودھری کے اپنے لفظوں میں —— "یار روینہ کو تو دیکھ کے ہم پگلئے گئے......"

آپ مانیں یا نہ مانیں، ہر آدمی کے دماغ کے اندر ایک رنگین گلیمر کی دنیا ہوتی ہے —— سو یہ دنیا ہمارے ہیرو نربھے چودھری کے ذہن میں بھی موجود تھی۔ غلط پہاڑا رٹنے کی باری تب آئی جب اپنے نربھے چودھری کو کچھ دنوں کے لئے جے این یو یعنی جواہر لال نہرو یونیورسیٹی رہنے کا اتفاق ہوا۔ پیسوں کی تنگی ہوئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کمپیوٹر میں گھس گئے۔ کمپیوٹر کے آئیں، بائیں، شائیں بٹنوں پر کمانڈ نہیں ہوا تو، ائر کنڈیشن والوں کو جوائن کر لیا۔ ائر کنڈیشن کی ٹھنڈک برداشت نہیں ہوئی تو واشنگ مشین بنانے والی ایک نئی کمپنی میں سیلس مین ہو گئے۔ یہ نوکری بھی نہیں ٹِکی تو کچھ دنوں تک ٹیوشن پڑھانے کا کام شروع کیا۔ یہاں تک کہ ساؤتھ ایکس جیسی پاش کالونی میں ایک لڑکی کو پڑھانے کا کام مل گیا۔ آخر ایم اے پاس تھے۔ لیکن بہاری میں انگریزی بولنے کی وجہ سے، یہ ''ریسپکٹڈ'' کام بھی ان کے ہاتھوں سے نکل گیا —— ان کی دقت یہ تھی کہ : ——

''ایاں لوگ انگریزی نہیں جانتے ہیں نا۔ بڑ بک ہم کو بہاری کہتے ہیں۔ بتایئے بہار کوئی انڈیا سے باہر ہے کا؟ بڑے قابل بنتے ہیں۔ ارے ہم جو انگریزی بول دیں گے، ای کا بولیں گے۔ گاندھی جی بھی موتیہاری گئے تھے۔ پتہ ہے۔''

ڈھنگ کی نوکری کیا ملتی، چپل گھستے گھستے دوردرشن کے لئے سیریل بنانے والے پروڈیوسر جے گوسوامی سے ملاقات ہو گئی۔ کریٹیو ریلس —— بن گئے۔ کریٹیو ریلس کے پروڈکشن منیجر۔ وزیٹنگ کارڈ بھی چھپ گیا۔ جمنا پار علاقے میں سستے ریٹ پر ایک چھوٹا سا کمرہ مل گیا۔

تو گلیمر کی جو رنگین سی دنیا کبھی فلم ریل کی طرح ذہن کے پردے پر چلتی تھی، اب آنکھوں کے سامنے تھی —— شوٹنگ، ایکشن، کٹ، لائٹس، لڑکے، لڑکیاں......اور مزے کی بات یہ کہ چاروں طرف دوڑتے ہوئے ہمارے نربھے چودھری کہیں اکڑتے ہیں، کسی لائٹ والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے باتیں کرتے ہیں، کبھی ''ہیروئن'' کے سامنے ٹھمکا لگاتے ہیں ——

کچھ چاہئے تو نہیں آپ کو......؟

ہیروئن مسکرا کر پوچھتی ''آج آپ بڑے خوش نظر آ رہے ہیں''

جواب ملتا ''آپ کو دیکھ کر کون خوش نہیں ہوگا''

'ہو ہو ہو، ہیروئن قہقہہ مار کر ہنستی ——

پیک اپ کے بعد جب چار یار شراب کی بوتلیں کھول رہے ہوتے، تو یہ باتیں ایکدم سے فنتاسی کی

طرح نربھے چودھری کو پاگل بنا دیتیں — عورت...... سیکس...... پچوئیشن۔ یہاں گفتگو میں صرف اور صرف عورتیں ہوتیں۔ چور دروازے سے دل میں داخل ہونے والی عورتیں......ان عورتوں کو لے کر ہزاروں قصے تھے۔ اور ایسا ہر قصہ نربھے چودھری کو زخمی کر جاتا تھا۔

••

رات گئے شوٹنگ کے خاتمے کے بعد نربھے چودھری جب اپنے کمرے میں پہنچتے تو خالی کمرے کا اندھیرا انہیں ڈسنے لگتا...... گفتگو والی عورتیں...... تنہائی اور خاموشی کی بین کی آواز پر ناگن جیسی لہرانے لگتی......بین کی آواز تیز ہوتی جاتی۔ پھر یہ ناگ ناگن تیز تیز لہراتے ہوئے ایکدم سے نربھے چودھری کے جسم میں داخل ہو جاتے۔ کافی دیر بعد جب اندر کا طوفان تھم جاتا تو نربھے چودھری کو لگتا......اس کی زندگی میں ایسی ہریالی کب آئے گی؟ کب تک عورت کے بغیر رہنا ہوگا۔

••

اجے گوسوامی —— نربھے چودھری کی نگاہ میں دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی تھا۔ آخر کو پروڈیوسر تھا۔ لڑکیاں اس سے چپکی رہتی تھیں۔ زندگی ہو تو ایسی، نربھے چودھری کو، اجے گوسوامی یعنی اپنے ہونہار آقا پر رشک تھا......

لیکن بھائی پیٹ کا اپنا اتہاس ہے۔ اور کبھی کبھی جب پیٹ کا جغرافیہ بگڑتا ہے نا، تو حالت بڑی بے رحم ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو نربھے چودھری فلمی دنیا کے آدمی بن گئے تھے، مگر اصل میں تھے کیا خاک پتی......نہ لاکھ پتی...... نہ ہزار پتی۔ بک بک جھک جھک کے بعد تو اجے گوسوامی کی گھانٹھ سے بندھے ٹکے دو چار پانچسو روپے نکلتے تھے —— کیا کہوں بھائی، دوردرشن کی حالت خراب ہے۔ ٹونٹی پرسنٹ تک دینے کو تیار نہیں۔ اب تم لوگوں کو دوں تو کہاں سے دوں......'

یہ الگ بات ہے کہ پروڈیوسر کو دھکادھک ٹرپل فائیو پینے کے پیسے مل جاتے تھے۔ کبھی کبھی نربھے چودھری عجیب عجیب حساب لگاتا۔ ایک آدمی کے کھڑے ہونے میں کتنے پیسے درکار ہیں؟ شادی کرنے میں کتنا خرچ بیٹھے گا؟ شادی کے بعد کے خرچ میں کیا ہوں گے؟ اور اگر بچے آگئے تو؟ یعنی کم پیسے میں ایک ایسی دنیا جسے طے کرنے میں قطب مینار کی بلندی تک کے فاصلے پسینے نکال دیتے تھے...... نا بھائی......وہ ساری زندگی شادی نہیں کر سکتے۔ نا نو من تیل ہوگا نا رادھا ناچے گی......

نربھے چودھری گھبرا جاتے تو اجے گوسوامی کے بیڈروم میں منڈرانے والی لڑکیاں چپکے چپکے ان

کے دل ودماغ پر قبضہ کرنے بیٹھ جاتیں...... ہری ہری لڑکیاں، آسمان سے اتری ہوئی پریاں...... جیسے ایک دھند ہوتی ہے، ہے ان گھنی دھند میں کچھ بھی آگے پیچھے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا ہے...... لیکن نربھے چودھری اپنی پریشانی کی کینچلی اتارتے ہوئے دھند میں چپکے چپکے اتر جاتے ——

••

گھر سے خط آرہے تھے۔ پیسے چاہئے۔ اجے گوسوامی سے ڈرتے ڈرتے پیسے مانگے تو ناراض ہو گئے۔

"پیسے کیا ڈال میں پھلتے ہیں"

نربھے چودھری کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لہجہ کمزور ہوا...... دھیرے سے بولا

"ڈال میں تو نہیں لیکن...... ہمارے بنتے ہیں، ہمیں ضرورت ہے۔"

اجے گوسوامی نے ایک پل کو انہیں دیکھا، پھر ٹھٹھا مار کر ہنسے۔

کتنے دن سے شیو نہیں بنایا ہے، وہ پھر ہنسے —— پروڈکشن میں ہو۔ ایسا چہرہ بگاڑ کر رہو گے تو لڑکیاں گھانس نہیں ڈالیں گی۔ سنو، تم کہہ رہے تھے کہ ٹھنڈے پانی کی تکلیف ہے —— کہہ رہے تھے نا؟

••

گودریج کمپنی کا ایک پرانا سا فریج ڈرائنگ روم کے پاس والے کباڑ خانے میں دیکھا تھا۔ ایکدم علاؤالدین کے چراغ جیسا...... کبھی کبھی ان میں بوتلیں بھی رکھی دیکھی تھیں...... دو ایک بار اس نے خود اس میں سے بوتل نکال کر پانی پیا تھا، خشک گلے کو تر کیا تھا۔ اسے یاد آگیا۔ اجے گوسوامی اسے ٹٹولتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

اچھا فریج ہے۔ پینٹ کرالو تو کوئی مانے گا نہیں کہ سترہ ہزار سے کم کا ہے۔ صرف اندر کی لائٹ نہیں جلتی ہے۔ 'ڈھبری'، 'ڈھبری' کہتے ہو نا۔ وہ پھر ہنسے...... مگر کیا روشنی میں موم بتی ڈھونڈنا ہے۔ ارے کھانا رکھو، چار دن بعد کھاؤ، تازہ ملے گا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیو۔ برف جماؤ۔ شربت لسی بناؤ، کیوں، فریج چاہئے؟

اور اس طرح علاؤالدین کے چراغ جیسی وہ فریج کب کیسے، نربھے چودھری کے کمرے میں آگئی، اس واقعے کا دن تاریخ یاد نہیں ہے۔ لیکن فریج ان کے کمرہ نما دنیا میں آچکی تھی۔ اور یہیں سے اس کہانی کی شروعات ہوئی تھی جس نے نربھے چودھری کے مکمل وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

(۲)

بہت پیچھے چھوٹا ہوا ایک گھر۔ گھر کے کسی تنگ کمرے اور تنگ کمرے کے کسی گرد آلود طاقچے پر رکھی ہوئی کچھ آدھی ادھوری خواہشیں —— مٹی کے مرجھائے پودے والے گملوں میں رکھے ہوئے کچھ خواب —— سہرکی تنگ وویران گلیوں میں اب اکیلے مٹر گشتی کرنے والے دوستوں کی جماعتیں۔

گھر سے چھٹی آتی تو جیسے یادوں کا ایک کارواں چل پڑتا اور جیسے سب نربھے چودھری کو گھیر کر بیٹھ جاتے۔

"وہاں موتیہاری میں سب کچھ چھوڑ کر آئے ہو۔ یہاں تیر مار لیاں ؟

نربھے چودھری کو پرچھائیاں گھیر کر بیٹھ جاتیں۔

اس دن گھر سے پھر چھٹی آئی تھی —— چھٹی میں ایک ماں کا خواب بند تھا۔ وہی پرانی داستاں کے بوسیدہ صفحے —— باپ ریٹائر ہو رہا ہے، بہن جوان ہے —— فکر کے چھوٹے چھوٹے طاقچوں سے گزرتے مسئلے۔

نیند نہیں آرہی تھی نربھے چودھری کو —— آسماں کے نیلگوں پردے پر رات بکھر چکی تھی۔ اچانک کمرے میں سرسراہٹ سی ہوئی —— پہلے چھم سے کوئی پائل بجی۔

نربھے چونک گئے —— کون ؟

نقرئی سا قہقہہ گونجا۔

نربھے چودھری اچھل گئے۔

"کون —— ؟"

"میں ...... میں ہوں"

وہاں روشنی تھی۔ روشنی کے دائرے میں ایک بلا کی قیامت کھڑی تھی۔ قیامت کے بدن پر کپڑے بھی قیامت کے تھے۔ چہرہ ایسا کہ خوبصورتی نے اپنی حدوں کو چھو لیا ہو...... بس اس سے زیادہ نہیں، ...... بدن کے نقوش اتنے تیکھے کہ دنیا کی ساری حسین عورتوں کے بدن بھی شرما جائیں...... کپڑے اتنے باریک اور جھینے کہ شاہی مخمل و کمخواب کے خزانے بھی ماند پڑ جائیں۔

اپنے نربھے چودھری خاصہ ہکلا رہے تھے۔

—— کہاں ...... کہاں سے آئی ہو ؟

—— وہاں...... فریج سے!

—— فریج سے؟

—— ہاں......،

—— کیوں......،

—— کیوں! عورت کے ہونٹوں پر بلاخیز تبسم تھا —— بوتل سے جن آسکتا ہے، فریج سے عورت نہیں آسکتی،

—— لیکن کیوں آئی ہو؟

جواب میں عجیب سی بے تکلفی شامل تھی۔

—— 'تمہارے لئے،

—— میرے لئے!

—— ہاں، تمہارے لئے،

یقیناوہ دنیا کی سب سے خوبصورت مسکراہٹ تھی جواس کے ہونٹوں پر بجی تھی۔

—— 'صرف تمہارے لئے'

—— مجھے...... یقین کیوں نہیں ہورہاہے"

—— پاگل ہو، فریج والی عورت ہنسی۔ دیکھومیں صرف تمہارے لئے ہوں۔

—— توکیامیں تمہیں چھوسکتاہوں......

نقرئی قہقہہ پھر گونجا...... "دریاسے صرف قطرے کی تمنا رکھتے ہو......ارے آگے بڑھو۔ میں تمہاری ہوں، صرف تمہاری ہوں......"

اس نے ہلکی سی انگڑائی لی...... کپڑوں میں یوں ہلچل ہوئی جیسے آندھی سے گھر کی کھڑکی، دروازے ہلنے لگے ہوں۔ یقیناًیہ ایک توبہ شکن انگڑائی تھی...... سرخ پھولے ہوئے ہونٹ۔ لمبی گردن۔ کپڑوں سے انگاروں کی بارش کرتاہوانوخیزبدن......

وہ والہانہ طریقے سے ہنسی...... "بڑھونا...... آگے بڑھو۔"

اور ایک جھٹکے سے اس نے کپڑوں کے ہک کھول دئے تھے......اندھیرے کمرے میں روشنی کے گول دائروں کے بیچ ایک برہنہ جسم دعوت نظارہ دے رہا تھا۔"یار! یہ صرف تمہاراہے...... دریاسے صرف

قطرے کی توقع رکھتے ہو......!"

نربھے چودھری کے بدن میں لرزش ہوئی۔ جسم میں ایک طوفان سا آیا۔ شریانوں میں خون کے گرما گرم لاوے دوڑ گئے۔ تو کیا یہ کوئی خواب تھا۔ مگر نہیں ...... وہ مجسم سامنے کھڑی تھی......اور ایسا توبہ شکن، پرکشش بدن انہوں نے خوابوں، خیالوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

پھر جیسے چاند کی کشتی میں ہلچل ہوئی......اور کشتی چاند کی برفیلی سطح کو پگھلاتے پگھلاتے دھند کی سرنگ میں ڈوب گئی......

••

وہ ہوش میں آئے تو سانس تیز تیز چل رہی تھی......کپڑے ادھر ادھر بکھرے تھے......عورت غائب تھی......فریج کا دروازہ بند تھا...... کمرے میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی تھی......اور اس سے بھی زیادہ بدن ایک عجیب سی لذت میں ڈوبا ہوا تھا۔

(۳)

"سنو یہ کیا کہہ رہا ہے۔" اجے گوسوامی زور زور سے قہقہہ لگا رہے تھے۔ نہیں بھائی، مجھے......مت روکو، ہنسنے دو......یعنی کہ، فریج میں عورت......فریج میں......اور کہیں نہیں ملیSS ہوSہو ہو ہوSSS یعنی کہ چوکی کے نیچے، نہیں، ٹب کے اندر نہیں۔ انٹرنیٹ کی عورت سنی ہےSS ٹیلی فون کال والی عورت کے بارے میں سنا ہے، نمبر ملایئے، مستی بھری باتیں کیجئے......یہ سب ٹھیک ہے......مگر فریج میں، ہو ہو، یار تم سچ مچ پگلا گئے ہو......

اجے گوسوامی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں نے بھی ٹھہاکا لگایا۔ اس وقت ان کے گھر نئی اسکرپٹ کو لے کر میٹنگ چل رہی تھی۔ نربھے چودھری سے بس یوں ہی دریافت کیا تھا——یار فریج ٹھیک سے کام کر رہا ہے نا؟

"کام کیا کر رہا ہے، فریج میں عورت آگئی ہے۔"

نربھے چودھری کے منہ سے یہ جملہ نکل تو گیا لیکن ماحول پر جیسے اس جملے کا پہلی بار میں کوئی اثر نہیں ہوا۔ اجے گوسوامی رائٹر کے ساتھ اسکرپٹ کی بات چیت میں لگا رہا۔ ہاں پاس بیٹھے آدمی نے چٹکی لی۔

"نربھے جی! شادی نہیں کروگے تو فریج میں عورت ہی رہے گی۔ سامان تو نہیں رہیں گے نا"

"اب لو جیسے ہم جھوٹ کہہ رہے ہیں۔ عورت آگئی ہے تو سامان کہاں رکھیں بھائی۔"

اجے گوسوامی نے ڈانٹا —— ''اپنا بہاری غصہ یہاں مت دکھاؤ...... کہہ دیا نا پیسے مل جائیں گے —— شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔ تم آرٹ ڈائرکٹر سیٹ ڈیزائنر، کسٹیوم، میک اپ مین، سب کی ڈیٹیل تیار رکھو —— اور ہاں، وہ رائٹر کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسے تھے۔ شادی کرلو —— کہو تو اس سیریل کی ہیروئن سے کروادیں، کیوں ؟

رائٹر نے بھی ٹھہاکا لگایا۔ ''پھر فریج سے عورت نہیں آئے گی''

اس بار نربھے سے نہیں رہا گیا۔ اس کا غصہ واجب تھا۔ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ سمجھتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ پیسہ مانگنے کے لئے اپنی جھنجھلاہٹ دکھارہے ہیں۔ سمجھئے —— آپ کی مرضی —— لیکن ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔ ہنمان جی...... جے بجرنگ بلی، جس کی چاہیں قسم لے لیجئے۔ وہ عورت تھی۔ ہاڑ مانس کی عورت، ارے، پری لوک میں ایسی کیا عورت ہوگی۔ جو وہ تھی، ہم تو آواز سنتے ہی سکپکا گئے۔''

کمرے میں ہنسی کا دورہ پڑا۔

ایک آواز ابھری۔ 'پھر وہ فریج کھول کر آپ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

'ہاں ایسا ہی ہوا۔ بالکل ایسا ہی......'

'پھر تو آپ نے......'

اس کے بعد ہنسی کے دورے نے رکنے کا نام ہی نہیں لیا۔

''ہنسئے آپ لوگ۔ ہنسئے۔ میرے پاس بے کار کا وقت نہیں ہے، آپ کی ہنسی میں شریک ہونے کے لئے۔ میں جارہا ہوں۔''

نربھے چودھری کمرے کے ہنسی ٹھہاکا کے بیچ کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

مگر...... جاتے کہاں ؟

ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔ کیا سچ مچ رات جو کچھ ہوا وہ خواب نہیں تھا۔ فریج میں سے عورت۔ جیسے آسمان سے دودھیا چاند خاموشی سے ایک رات، آپ کے ساتھ رہنے کے لئے آجائے۔ نہیں نربھے چودھری، وہم ہوا ہے تمہیں وہم......

••

نربھے شام گئے تک آوارہ سڑکیں ناپتے رہے۔ سڑکوں پر ناچتی تتلیاں...... لیکن فریج والی

تتلی......شام کے گھنے سائے پھیل گئے تھے۔ڈھابے میں کھانا کھایا —— تب تک رات کے نو بج چکے تھے۔اب ایک ہی منزل تھی، گھر —— پھر وہی راستے......وہی کمرہ......وہی تنہائی...... مگر......

دروازے کا تالا کھولنے تک، نئے احساسوں والا کپڑا بدل چکے تھے نر بھے چودھری- کیوں ؟اس کا جواب نہیں دے سکتے تھے۔بس دروازے......اور تالا کھولنے تک کوئی پختہ ذہن کا آدمی ان کے اندر سما گیا تھا۔کہیں سے خوشبو کا تیز ریلا اٹھا تھا۔ایک جانی پہچانی سی خوشبو —— یہ خوشبوان کے پورے جسم، پورے وجود کو معطر کر رہی تھی...... لیکن کیوں ؟دل دھڑک رہا تھا۔اس طرح کی بے چینی سے پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا......اور یہ سب کل ملا کر ایسا تھا، جیسے ابھی حال میں ان کی شادی ہوئی ہو۔گھر پر نئی نویلی دلہن انتظار کر رہی ہو......

وہ دروازہ کھول کر اندر گئے اور جیسے سہم گئے...... چھناکہ سا ہوا ——

کمرے میں روشنی تھی۔بتی جلی ہوئی تھی۔ایک خالی میز جو کافی دنوں سے بیکار پڑی تھی، صفائی کر کے اسے سنگار میز میں بدلا جا چکا تھا۔کمرے میں جیسے عطر کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔نیا بستر...... نئی چادر، چادر پر خوشبو دیتے پھول بھی بکھرے تھے۔سنگھار میز کے پاس وہ دنیا جہاں سے بے نیاز اپنے سنگھار میں یوں ڈوبی تھی جیسے نئی نویلیاں دولہے کے آنے کے انتظار میں دنیا جہان سے بے خبر ہو جایا کرتی ہیں۔

اس نے نظر اٹھائی، مسکرائی...... کان کے جھمکے کی کیل درست کی —— آئینے میں فخر سے اپنا چہرہ دیکھا...... پھر جیسے جل ترنگ کو دھیرے سے چھوڑ دیا گیا ہو ——

—— 'آگئے تم ؟'

—— 'میں......' نر بھے پسینے پسینے تھے......

—— ہاں تم...... تم،

وہ آہستہ سے ہنسی...... جیسے موسیقی سناتی لہروں کو موسیقار نے اچانک ایک نئی دھن دی ہو......وہ آگے بڑھی۔آج اس نے ریشمی ساڑی پہن رکھی تھی، ہلکی آسمانی رنگ کی......اس پر سانولی دھوپ کے رنگ کی لکیریں جھلملا رہی تھیں......اس سے میچ کرتا بلاؤز تھا......وہ اس کے بالکل قریب آکر ٹھہر گئی۔ اتنے قریب کہ وہ اس کی سانسوں کے سرگم سن سکتا تھا...... اتنے قریب کہ وہ دھڑکنوں کے حساب لگا سکتا تھا......

وہ ہنس رہی تھی۔

—— کیا آج بھی تمہیں سب کچھ خواب سا لگ رہا ہے۔

—— ہاں

—— پاگل ہو...... دیکھو، میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کہہ سکتے ہو، یہ وہی کمرہ ہے جہاں تم رہتے تھے؟

—— نہیں

—— 'وہ پینٹنگس دیکھی؟'

—— پینٹنگس؟

—— ہاں، وہ ہنسی —— وہ دیکھو...... ناریوفو، کی پینٹینگس، خواب دیکھتی عورت کے ہاتھ میں ایک مرا ہوا بچہ......

—— بچہ مر کیوں گیا ہے؟

میں نہیں بتاؤں گی۔ تم بولو، میں تو فرتیج سے آئی ہوں۔ اور یہ پینٹنگ تمہاری دنیا، تمہارے لوگوں کے لئے ہے۔ لیکن سچائی یہی ہے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے اور بچہ...... بچہ مر چکا ہے —— !

—— بچہ مر کیوں گیا...... ؟ وہ پھر بوجھل آواز میں بولا۔

اس لئے کہ عورت خواب دیکھ رہی ہے۔ جانتے ہو ناریوفو نے یہ غیر معمولی پینٹنگ کب بنائی تھی؟ ۱۹۴۲ء کے آس پاس۔ جب تم دنیا کو دوسری عالمی جنگ میں جھونک چکے تھے۔ کیا نہیں...... یاد آیا اور خود تم لوگ کیا تھے...... آزادی مانگ رہے تھے۔ بھکاریوں کی طرح، مٹھی بھر لوگ، جو تمہارے گھر پر قبضہ کر چکے تھے۔ تم ان سے چلے جانے کی مانگ کر رہے تھے۔ ہے نا، وہ بھی بھکاری کی طرح...... ایسے ہی ہو تم، اس نے ٹھنڈا سانس بھرا ——

"ایک پراسرار تہذیبی نگر کی تعمیر کرنے والے اور ایک جھوٹی جذباتیت کا استقبال کرنے والے —— ہے نا...... " وہ کہتے کہتے پھر ہنسی......

—— لیکن، یہ سب تم...... ؟

—— تمہارے لئے لائی ہوں۔ گھبراؤ مت۔ چوری نہیں کی ہے۔ چوری کر بھی نہیں سکتی ہوں...... بازار سے لائی ہوں۔

—— تم بازار گئی تھی؟

—— ہاں کیوں؟

—— نہیں، میں سمجھ رہا تھا......

—— تم زیادہ سمجھنے کی کوشش مت کیا کرو —— سنو مجھے اس طرح گندے میں رہنا پسند نہیں ہے۔ سنا تم نے —— اس لئے میں نے صفائی کی، عطر کا چھڑکاؤ کیا، دیواروں پر پینٹنگس لگائی، پھر تمہارے آنے کی راہ تکنے لگی، اور تم آگئے —— اس نے گلے میں بانہیں ڈال دیں ——

شاید وہ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی کی سب سے خوبصورت انگلیاں تھیں......ایسی انگلیاں، جن کے لئے الفاظ اور محاورے بھی کم پڑ جاتے ہیں۔

پشت پر اس کی گرم گرم ہتھیلیوں کا رقص، جسم میں عجیب سی سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ پھر جیسے تابڑ توڑ اپنے گرم گرم بوسے سے اس نے نربھے کی آتما کے اندر تک، عجیب سی سنسنی پھیلا دی......ایک لمحہ کو ٹھہری، پھر بارش کے آخری قطرے تک اسے شرابور کرتی چلی گئی ——

'سنو!'

'کیا ہے —— 'نربھے کی آواز جیسے ہزاروں فٹ نیچے کنویں میں چھوٹ کر رہ گئی تھی ——

سنو: جب تم چلے گئے ہو تو بڑے یاد آتے ہو۔ اتنا انتظار کیوں کراتے ہو......'

قسم سے، وہ دنیا کے سب سے مدھر، سب سے ذائقہ دار، سب سے حسین اور سب سے زیادہ جلتے ہوئے ہونٹ تھے، جس نے اپنی تپش سے ایک بار پھر اس کیلئے جنت کے دروازے کھول دئے تھے......

"چلو منہ ہاتھ دھو لو...... تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔ گھبراؤ مت، اب تمہارا پورا خیال رکھوں گی میں......مگر......"

"مگر —— مگر کیا......؟"

ابھی نہیں......اوہ...... تم میں کچھ بھی جاننے کی بے چینی کس قدر ہے۔ شاید تم نہیں جانتے......انہیں باتوں نے......ہاں، انہیں باتوں نے......اوہ...... آئی لو یو نربھے......

جیسے زمین چلتے چلتے رک گئی ہو...... آسمان تھم سا گیا ہو...... کوئی چونکانے والا، جذباتیت سے بھرا فلمی نظارہ ہو —— پہلی بار اس لڑکی کے ہونٹوں پر نربھے کا نام آیا تھا......نر...... بھے...... پہلی بار......دلی کے بازار واد کنزیومر کلچر میں آہستہ آہستہ یہ نام کتنا عجیب، کتنا بے رس اور کتنا بدنما لگنے لگا تھا۔ جیسے 'موتیہاری' کی ایک خاص خوشبو اس کے نام سے لپٹی ہوئی ہو......وہ اس نام کو بار بار دلی رنگ میں بدلنے کا

خواہشمند تھا۔ مگر آج...... جیسے اس نام سے زیادہ خوبصورت کوئی دوسرا نام ہو ہی نہیں سکتا تھا......

'چائے' —— وہ اچانک جیسے خواب سے جاگا

—— اتنی دیر میں اس نے چائے بھی بنالی تھی...... چائے نربھے کے ہاتھوں میں کانپ رہی تھی......وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

'ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟' وہ مسکرائی

'کیا یہ خواب ہے؟'

'کیوں؟'

'سوچ رہا تھا، ہم جیسوں کے لئے خواب ہی کیوں ہوتے ہیں؟ زندہ رہنے کے لئے بھی خواب، محبت کرنے کے لئے بھی خواب......'

وہ اٹھی، اپنی لمبی مخروطی، شہادت کی انگلی نربھے کے کانپتے ہوئے ہونٹوں پر رکھتی ہوئی بولی ——

'میں خواب نہیں ہوں۔'

'پتہ نہیں'

خواب کا جسم نہیں ہوتا ہے......اس کی نقرئی ہنسی کمرے میں پھیلتی چلی گئی۔ وہ اٹھ کر سنگھار میز کے قریب کھڑی ہوگئی......وہ جیسے اپنے عکس کو بیحد پرکشش انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر جیسے کمرے کی تنہائی میں شعلہ بھڑکا......رات 'اسٹوب گیس' کی طرح چیخی، اور کمرے میں آگ کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں......اس نے بلاؤز کے ہوک کھول دئے......ریشمی ساڑی، دنیا کے سب سے حسین بدن سے الگ ہوکر، اس کے بستر پر بے ترتیبی سے پھیل گئی تھی...... کمرے میں جیسے 'لیزر ریز' کا رقص چل رہا ہو...... گداز بانہیں، صدیوں کی پیاسی اور عقیدت کی حد تک، میناروں کے سفید گنبد کی طرح تنے ہوئے مصفہ سینے......یادو قبہ نور......دنیا کے سب سے حسین پاؤں......اس کی آنکھوں کی کشتیوں میں اس وقت وہی کشش تھی جو شاید خالق دوجہاں کو سب سے خوبصورت تصور گڑھنے کے دوران ہوئی ہو......اس نے اپنی بانہیں پھیلائیں۔

'آؤ' —— اس کی آواز میں ہیجان کی حد تک سنسنی خیزی آگئی تھی...... آؤ......اوہ...... تم دیر کر رہے ہو...... آؤ، اس سچ کے لئے، جس کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں......اس سچ کے لئے، جس کے لئے

آخری سانس تک ہم اپنے جینے کی آس قائم رکھتے ہیں۔

اور نربھے چودھری، جیسے آنکھیں بند تھیں، جیسے خوابوں سے جنت کی طرف ایک خوشبو لٹاتی کھڑکی کھل گئی ہو۔ جیسے ہوامیں تیرتا ہوا ایک رتھ ہو۔ اور رتھ، زندگی کے سب سے خوبصورت ذائقے کو پور پور میں امر کرتا ہوا اڑتا جاتا ہو......

جیسے ہوا تھم گئی تھی...... سانسیں رک گئیں...... اس کے بدن پر دنیا کا سب سے خوبصورت ننگا جسم اپنی تمام تر 'ہیجان خیزیاں' لٹا کر تھکا ہارا، اس کے جسم کے گوشت سے 'عبادت' کی ایک نئی عبارت لکھنے میں مصروف تھا —— اس کی آنکھوں میں شوخیاں تھیں......

"سنو"

اس کے بدن کی بیکراں موجیں، اس کے بدن کے ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں......

'سنو —— اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'

'پیسے؟'

'ہاں، پیسے —— جو تھے سب ختم ہو گئے۔ پینٹنگس، عطر، چادریں اور...... جو پیسے تھے، وہ تمہارے گھر کی خریداری میں لگ گئے......

'ہاں'

'مجھے چاہتے ہو تم؟'

'ہاں'

'میری سانسوں سے پیار ہے؟'

'ہاں'

'میرے جسم سے؟'

'ہاں'

'اور مجھ سے؟'

'ہاں'

'اور یہ بھی چاہتے ہو کہ میں کہیں نہیں جاؤں، میں ہمیشہ تمہارے پاس رہوں......'

'ہاں'

'تو پھر تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا۔'

وہ اپنے بدن کی 'بے کراں موجوں' کو سنبھالے، اس کے بدن کے ساحل سے ہٹ گئی تھی......

'سمجھ رہے ہونا، نربھے چودھری...... تمہیں میرا خیال رکھنا ہوگا......'

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی ریشمی ساڑی کی شکنوں میں کھو گئی تھی ——

'تمہیں مجھے خوش رکھنا ہوگا۔ میری...... فرمائشیں پوری کرنی ہوں گی...... سن رہے ہو، نربھے چودھری...... میرے لئے......'

اس کی نقرئی لڑکھڑاتی آواز کا 'جلترنگ' کمرے میں گونج رہا تھا۔

'سوچو میں —— ڈھل جاؤں تو؟ میں جیسی ہوں، ویسی نظر نہ آؤں تو...... یہ سب کچھ تم پر ہے نربھے چودھری...... تم پر...... مجھے خوبصورتی پسند ہے۔ اس کمرے کو جنت سے زیادہ خوبصورت بنادو۔ مجھے خوشبوئیں پسند ہیں...... میرے لئے خوشبوؤں کا خزانہ لے آؤ...... میرے لئے تم بھی اپنے آپ کو بدلو گے نربھے چودھری...... بدلو گے نا......؟ خوشبو کو، خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ سب کروگے نا نربھے چودھری، ورنہ......ورنہ......'

••

لفظ بجتے رہے...... بجتے رہے۔ وہ اٹھا تو سورج کی شعائیں سیدھے کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھیں...... فریج والی لڑکی غائب تھی رات کی سچائی کے احساس کے لئے وہ سب چیزیں، یہاں تک کہ 'نابوکوف' کی پینٹنگس تک کمرے میں موجود تھی۔ بستر پر وہ ننگ دھڑنگ پڑا تھا۔ ابھی بھی جیسے خوشبوؤں نے چاروں طرف سے اسے اپنے دائرے میں لے رکھا تھا...... مسرت کا عجیب سا احساس اب بھی ہو رہا تھا۔

'یہ سب کیا ہے؟'

یہ کیا کیسا خواب ہے۔ وہ سمجھ پانے سے قاصر تھا۔ کپڑے پہن کر اس نے ڈرتے ڈرتے فریج کھولا۔ فریج خالی تھا...... مگر وہی رات والی خوشبوئیں فریج کے اندر بھی بسی ہوئی تھیں۔

(۴)

اب نربھے چودھری نکلنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن کیا یہ وہی پرانے نربھے چودھری تھے۔ حلیہ پوری طرح سے بدلا ہوا۔ کالی آئرن کی گئی پینٹ پر پوری آستین والی سفید شرٹ۔ اور دنوں کی طرح جھٹ

پٹ جو ملا پہن کر تیار نہیں ہوئے نربھے چودھری۔ کپڑے ہی کتنے تھے۔ اس پر بھی دھلے ہوئے کپڑوں کی تعداد کتنی ہوتی تھی۔ لے دے کر ایک دو جوڑے کپڑے بھی خود ہی دھونے پڑتے تھے۔ لاجپت نگر مارکٹ سے دو نمبر کا سستا سا آئرن مل گیا تھا تو اٹھا کر لے آئے نربھے چودھری۔ لیکن کپڑے آئرن کون کرے۔ صبح صبح بس پکڑنے کے چکر میں آئرن بے چارا ویسے ہی 'کوٹ' کے ڈبے میں بند رہا لیکن۔ دلی آنے کے اتنے برسوں بعد جیسے سارے قاعدے قانون ان کے لئے بدل گئے تھے اور تو اور...... دو ایک ٹائی لوہے والے صندوق میں پڑی تھی، کبھی گفٹ میں ملی ہوگی لیکن پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ وہی موتیہاری کا چھیلا۔ اپنے یہاں عام دنوں میں وہ ایسے سوٹیڈ بوٹیڈ ہو کر نکل سکتے تھے؟ کیوں نربھے چودھری؟ پیچھے سے 'سٹاک' سے کمنٹ پاس ہوتا —— "نیا ہے، کاہے بھائی، موتیہاری کا چھیلا۔"

لیکن آج موتیہاری کے اسی چھیلے نے اپنی شکل وصورت بدل ڈالی تھی، اس پر پرفیوم۔ یہ پرفیوم کی شیشی اسے مادھری نے دی تھی۔ اپنے کریٹیو ریلین کی پرماننٹ ایکٹرس۔ جس کے بارے میں یونٹ والوں کا کہنا تھا —— ارے مادھری کا ٹانکا اجے گوسوامی سے، کوئی آج سے 'بھڑا' ہے۔ دیکھتے نہیں، ان کے ہر پروڈکشن میں کوئی نہ کوئی رول ضرور ہوتا ہے۔

'مادھری'

ایک مخمور کا پاہنداس۔ پتہ نہیں اس دن کیا خاص بات تھی۔ کوئی خاص بات تھی، تو بس یہ تھی کہ مادھری اسے سیٹ پر تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ پھر اسے دیکھ کر مادھری کی آنکھوں میں جیسے چمک آگئی —— "نربھے جی! آپ یہاں ہو۔"

"کیوں؟"

"ارے ہم آپ کو کہاں کہاں تلاش کر رہے تھے۔"

"کیوں؟" اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ مادھری جیسی لڑکی اسے تلاش کر سکتی ہے۔ بیٹا یہ ہے فلم میں آنے کا مطلب، کا؟ کہ مادھری جیسی لڑکیاں بھی، ہےss ہےss اس سے کیسیں نپوڑیں۔ اور مادھری نے پرفیوم اس کی طرف بڑھا دیا —— "خاص تمہارے لئے، دارجلنگ گئی تھی شوٹنگ میں۔ دیکھو وہاں بھی تمہیں نہیں بھولی۔"

نازک سالمس۔ مادھری نے ہلکے سے پرفیوم کا چھڑکاؤ اس کی قمیص پر کیا۔ آنکھوں میں قوس قزح تن گئے۔ لیکن فوراً ہی الیا راجا کی فلم "اپو راجا" کا وہ بونا اسے یاد آگیا جسے فلم کی اداکارہ نے انگوٹھی دیتے

ہوئے جلدی جلدی کہا تھا —— ''منگنی سمجھتے ہونا، کل صحیح وقت پر پہنچ جانا، دیر مت کرنا۔'' اداکارہ نے وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنادی تھی۔ بونا کمل ہاسن، اپنے بونے جوکر دوستوں میں منگنی کی اس انگوٹھی کو لے کر کتنا خوش ہوا تھا۔ گانا بھی گایا۔ دوستوں نے بھگوان کی طرف سے اچنبھے کے طور پر لکھی جانے والی تقدیر کے لئے اسے مبارکباد بھی دی۔ مگر آگے اس وقتی خوشی کا نتیجہ کیا نکلا تھا —— ''ارے اپو انگوٹھی تو نکالو، دیر ہو رہی ہے، اور اداکارہ رجسٹرار کے پوچھے جانے پر ہنستی ہے۔ ''گواہ یہ ہے اپنا اپو۔ چلے گا......''

'چلے گا —— ؟ رجسٹرار ہنستا ہے......

پرفیوم لے کر دیر تک نربھے چودھری گم صم کھڑا رہا۔ لیکن وہاں اس پر ہنسنے کے لئے کوئی رجسٹرار نہیں تھا۔ اسے لگا، الف لیلیٰ جیسی کسی کہانی کے اوراق اس کے سامنے کھل گئے ہوں۔ مادھری بند اس ہے تو کیا ہوا...... لوگ غلط بولتے ہیں...... مادھری ایسی ہو ہی نہیں سکتی...... وہ بھی اجے گوسوامی ۔ ؟ کیا اس کے پاس اجے گوسوامی جیسے لوگوں کی کمی ہے ...... ؟ اور پھر...... یہ تو میڈیا ہے میڈیا۔ یہاں تو ایسی کہانیاں روز بن جاتی ہیں۔

'مادھری!'

ہونٹوں تک آکر یہ نام جیسے رس شرنگار سے بھرپور کوئی غیر معمولی شاعری میں بدل گئی ہو لیکن شاعری کتنی جلد باس اور سڑاند دینے لگی تھی......

'مادھری'...... وہ اسے پکارتا ہوا میک اپ روم میں چلا گیا —— دروازہ کے پٹ آن میں کھلے تو، وہ جیسے موتیہاری کا لمبے قد والا بونا بن گیا تھا۔ اجے گوسوامی کی بانہوں میں قید مادھری۔ مادھری نے چلا کر آواز دی تھی...... ارے...... نربھے...... سنو تو......'

جانے دو...... یہ اجے گوسوامی کی آواز تھی......

'تمہارے والے میں سے ایک پرفیوم میں نے......'

اجے ہنس رہے تھے —— ''پرفیوم، اور یہ بہاری...... تم بھی پاگل ہو مادھوری...... ''دونوں کا ایک ساتھ قہقہہ گونجا تھا۔ لیکن اب، کچھ بھی آگے سننے کو وہاں رکا نہیں، نربھے چودھری، جیسے پیچھے ہزا ۔ ل کی تعداد میں کتے پڑے ہوں۔ ڈیفوڈل ڈاکس، ڈیفوڈل چلتے ہوئے...... انگنت تعداد میں۔ اداکارہ نے منو کو انگوٹھی دی ہے۔ مادھری نے نربھے کو پرفیوم دیا ہے...... اپو سمجھتا ہے کہ......

بونا اپو 'پست' ہوتے ہوئے اپنے قد سے کتنا کم ہوا ہوگا؟ مگر —— نربھے...... وہ اپو سے زیادہ 'بے

وجود' ہو گئے تھے...... چھوٹا لمبے قد والا بونا۔ پھر وہ پرفیوم کمرے کی کال کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ شاید اسی نئی صبح کے انتظار کے لئے۔ اسی دھانی دھانی صبح کے انتظار کے لئے ——

پرفیوم کپڑے پر مارتے ہوئے ایک عجیب سی خفیف ہنسی نربھے کے ہونٹوں پر کھل رہی تھی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پیسے گنے تھے اور پہلا کام کیا تھا- اپنے قدم پاس والے بیوٹی پارلر کی طرف تیز کئے تھے۔

(۵)

"تم نربھے ہو...... نہیں، یقین نہیں آتا۔" اجے گوسوامی کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی تھی......

آس پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے نربھے کو غور سے دیکھا۔ چھوٹے ڈھنگ سے تراشے گئے بال، بدن پر قاعدے کی پینٹ اور شرٹ ——

"تو تم سچ مچ نربھے ہو؟"

"کیوں؟"

"یقین نہیں ہوتا۔"

"لیکن اس میں یقین نہیں ہونے کی......"

نربھے کہتا کہتا ٹھہر گیا۔ اجے گوسوامی اسے غور سے گھور رہے تھے۔ وہ جب اس طرح گھورتے تھے، اسے ڈر لگتا تھا......

"رہنے دو، دیکھتے نہیں......"

"مطلب......؟"

"مطلب، آج یہ خود پروڈیوسر بن گیا ہے۔ ٹرابال تو دیکھوsss

"ذرا چال تو دیکھوsss"

کمرے میں ٹھہاکا لگ رہا تھا......

"بال تو دیکھوsss گال تو دیکھوsss چال تو دیکھوsss شرٹ تو دیکھوsss پینٹ تو دیکھوsss پھر پورا ڈسکو شروع ہو گیا —— "

"دیکھو جی دیکھو —— نربھے کو دیکھوss ایک بار دیکھوss بار بار دیکھو"

نربھے گم صم تھا،وہ جان رہا تھا،مذاق اپنی حدوں کو پار کر رہا ہے...... سب سوچ رہے ہوں گے ــــ سالاssبدلا بدلا سا لگ رہا ہے بہاری۔ بہاری مطلب...... ،اسے لگا،مادھری اسے چڑا رہی ہے۔

لیکن فوراً ہی وہ عورت اس کی آنکھوں کی اسکرین پر چھاجاتی ہے۔'سن رہے ہو نا نربھے' ــــ ''خوشبو کو خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے۔ میرے لئے تم یہ سب کروگے نا...... ؟ کروگے نا، نربھے چودھری ؟ ......ورنہsssورنہ......''

لفظ لگاتار چیخ رہے تھے۔

اور ادھر ڈسکو جاری تھا ــــ

ذرا گھوم کے دیکھوssجے نربھےssآگے سے دیکھوssجے نربھے۔''

اجے گوسوامی نے اس کے بدلے چہرے کی آگ کو پڑھ لیا تھا۔ ٹھہرو۔ ٹھہرو، وہ چیخے۔یعنی حد ہوتی ہے۔حد ہوتی ہے بے شرمی کی۔ آپ سب نے ایک سیدھے سادے بہاری کو...... معنی ــــ بنئے مت......بہاری کوئی گالی تھوڑے ہی ہے۔''

اجے خالص نربھے 'اسٹائل' سے بول رہا تھے ــــ بہاری بدل نہیں سکتا کا؟ضرور بدل سکتا ہے......اور پوچھ کے دیکھو...... یقیناً،اس کے پیچھے بھی عورت کا ہاتھ ہوگا۔ کیوں نربھے ؟

''جیsss''

کسی نے آواز لگائی ــــ 'فریج والی عورت کا۔'

''ہاں بالکل''

''لو دیکھو......''

ہنسی کا فوارہ چھوٹا تو نربھے نے یکایک سامنے والے آرٹسٹ کا گریبان پکڑ لیا- ''سالے''

ماحول حیرت زدہ ــــ طبلوں کی آواز رک گئی ــــ جیسے سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ یکایک بہتی ہوئی ہوا تھم گئی۔ مذاق اڑاتے لوگوں پر بجلی گر گئی۔ نربھے کا سارا غصہ چہرے پر سمٹ آیا تھا۔

اس نے جھٹکے سے بیچارے آرٹسٹ کا گریبان چھوڑا۔ ہتھیلیاں ابھی بھی گرم تھیں۔وہ یکایک پلٹا ــــ

''سنو اجے گوسوامی !ایک بات جان لو، بہاری بڑ بک بن سکتا ہے تو گریبان بھی تھام سکتا ہے۔ مجھے نہیں کرنا تمہارے ساتھ کام۔ کل پھر آؤں گا، پئی سا نکال کر رکھنا......''

پھر وہ ٹھہرا نہیں، واپس آ گیا۔

ماحول میں سناٹا چھا گیا، جو جہاں تھا، وہیں آنکھیں نیچی کیے کھڑا رہا۔ یہ کیوں ہو گیا؟ یہ سارا کچھ ویسا تھا، جیسے دوستوفسکی کے 'ایڈیٹ' نے پرنسز کی پارٹی میں کیا تھا۔ سناٹے کو بھنگ کیا اجے گوسوامی نے۔

''چلو چلو اسکرپٹ پر بیٹھتے ہیں......''

مگر وہ ابھی بھی اپنے چہرے کے احساس کو چھپا نہیں پائے تھے......

(۶)

''زندگی سرکس نہیں ہے۔ اور سنو نربھے، تم اپو نہیں ہو۔ تم اپو ہو بھی نہیں سکتے۔ تمہارے ساتھ میں ہوں، میں۔ سن رہے ہونا......؟

کمرے میں خوشبو پھیل چکی تھی...... نقرئی قہقہے پھر گونجےsssss

''دیکھوssss آج میں نے نیا سنگھار کیا ہے، تمہارے لئے صرف''

عورت اٹھتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ پور پور سے خوشبو کی لہریں پھوٹ رہی تھیں۔ آئینہ یقیناً حیران تھا کہ کبھی اس کے 'شیشے' جیسے وجود میں اتنا غیر معمولی 'عکس' بھی سما سکتا ہے۔

''پتہ نہیں مجھے...... مجھے کیا ہو گیا تھاss پتہ نہیں۔ اب وہ......''

''ڈرتے ہو''

''ڈرنا پڑتا ہے...... گھر ہے...... پتاجی ہیں......اور''

''میںss'' آئینہ نشے میں ڈوب گیا تھا......

''میںsss تمہیں میری پرواہ نہیں، پتھر ہو تم۔ میری طرف دیکھو......اس کا سنگھار ویسا تھا...... جیسے سارا عالم ہنسی رو کے ہو، کہ بادشاہ تو ننگا ہے......

''کیا دیکھ رہے ہو......''

جسم سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا نربھے۔ سمجھ رہے ہونا...... دیکھو تم مضبوط ہوئے......اور یہ کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا۔ یقین کرو میں صرف تمہارے لئے بنی ہوں...... تمہارے لئے۔ میں لہر ہوں...... جھرنا ہوں...... سنگیت ہوں...... خوشبو ہوں......اور سب سے زیادہ میں تمہاری ہوں...... تمہاری ہوں نربھے......

پھر جیسے روشنی کا دھماکہ ہوا......

آواز میں سنگیت پیدا ہوا —— آؤ مجھ میں سما جاؤSS سما جاؤSSS

اور ——

قارئین!

ٹھیک اسی لمحہ جو کچھ پیش آیا۔ نہیں جانے دیجئے۔ نہیں ٹھہرئے۔ یعنی، جو کچھ ہونے جارہا تھا۔ نہیں ٹھہرئے۔ میں اپنا تبصرہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ مگر اسی لمحہ، اس جگمگاتے، روشن کمرے میں یکایک بھگدڑ مچ گئی۔ یکایک باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ عورت پہلے متحیر ہوئی۔ پھر سنگیت تھما۔ خوشبو اڑی، لہریں گم ہوئیں۔

دستک بڑھتی گئیں۔

کمرہ یکایک چیخ پکار کرنے لگا۔ عورت فریج میں چلی گئی

دروازے پر اجے کے آدمی کھڑے تھے۔ لفافہ میں نربھے کے پیسے پڑے تھے......

''گن لو......''

''گننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اور...... صاحب نے کہا ہے کل سے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ٹھیک'' —— نربھے نے دروازہ بند کرنا چاہا

آگے والے مسٹنڈے آدمی نے دروازہ چھیک لیا ——

''سنئے دروازہ مت بند کیجئے''

''کیوں؟''

مزدور ساتھ میں ہیں...... صاحب نے فریج واپس منگوایا ہے!''

نربھے حیرت زدہ کھڑے ہیں......

مزدور فریج اتارنے اور لے جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

☆☆

حسن جمال

سکون کی تلاش

شام کے دھندلکے میں وہ موٹا شخص مجھ سے ٹکرایا تھا۔ میں شام کی سیر کے واسطے قریبی پارک میں روز کی طرح گیا ہوا تھا جہاں کے لان اجڑ چکے تھے اور پھولوں نے مہکنا چھوڑ دیا تھا اور جہاں گائیں، بھینسیں اور کتے انسانوں کے ساتھ چہل قدمی کرنا اپنا معمول بنا چکے تھے اور جہاں تاش کے شائقین دنیا جہان سے بے خبر رہتے تھے اور جہاں مقید حیوانوں کو دیکھنے کے لئے بھی پیسہ خرچ کرنا پڑتا تھا۔ کئی دفعہ تو یہ گمان ہوتا تھا کہ آیا جالیوں کے اس طرف سے حیوان انسانوں کو دیکھ رہے ہیں یا ادھر سے انسان جانوروں کو! اور یہ بھی ایک سوال تھا کہ وہ یہ سب دیکھ کر پاتے کیا ہیں؟ —— اگر دیکھنا ہی ہو تو انسان اپنے آپ کو دیکھ لے —— اپنے ہی گھر میں مقید! —— لیکن اس وقت Zoo بند ہو چکا تھا۔

میں ۱۹۳۵ء میں استادہ لکڑی کی بستر بنچ پر بیٹھا ہوا ذرا سستا رہا تھا اور اٹھنے ہی والا تھا کہ وہ دفعتاً اشوک کی لاٹ کی طرح میرے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ بنچ پشت سے محروم تھی۔ ہر تین چار سال بعد مرمت کے باوجود اس وقت بھی تین تختیوں میں سے ایک تختی ندارد تھی اور میں بے آرامی سے بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری کوئی بنچ خالی نہ ہونے کی وجہ سے میں اسی پر بیٹھنے کو مجبور تھا۔ باغ میں گھومتے ہوئے میری آنکھیں بھی گردش کر رہی تھیں کہ ستانے کے لئے کوئی اچھی سی بنچ مل جائے مگر اکثر میرا نصیب مجھے دھوکہ دے جاتا۔ عموماً ایسی ہی ٹوٹی پھوٹی بنچ مجھے میسر ہوتی۔ ایک وقت تھا جب کہ لان پر بھی بیٹھا جا سکتا تھا۔ آجکل گیلی کبھی خشک مٹی کا کپڑوں پر لگنے کا خدشہ رہتا تھا۔ نرم ملائم گھاس تو عنقا ہو چکی تھی۔

میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ وہ لحیم شحیم تھا۔ موٹا، جیسے ٹھونس کر اس میں ہوا

بھری گئی ہو۔ لمبا قمیص، پاجامہ، ہوائی چپلیں، گنجا، چکنا سر، کھوپڑی کی پشت میں کچھ بال آثار قدیمہ کی طرح نظر آتے تھے، چہرہ گمبھیر تھا پھر بھی شک و شبہ میں مبتلا ہو گیا۔ باغ میں سیر کرنے والوں کے علاوہ بھی کئی اشخاص گھومتے رہتے تھے، جن کے کردار مشکوک معلوم ہوتے۔ مالش کرنے والے، اٹھائی گیرے، غیر فطری مباشرت کے عادی لوگ۔ اکثر وارداتیں ہو جاتیں۔ موٹا شخص بنچ پر بیٹھنے لگا تو میں ذرا سرک گیا۔ میں عمر کے اس پڑاؤ پر تھا جہاں زندگی کچھ دیر ستانا چاہتی ہے مگر اندرون میں اتنی توانائی بھی کہ کہیں حسینہ کو مایوس نہ ہونا پڑے، لیکن چھکوں سے میں محتاط رہنا چاہتا تھا، کیا پتہ، یہ حضرت لوطؑ کے زمانے سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔

اس نے بغیر کسی تمہید کے براہ راست مجھ سے سوال کیا کہ کیا مجھے سکون چاہئے؟ —— سکون؟ —— کیا یہ کسی چیز کا نیا برانڈ ہے! پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا، نہ اخباروں نہ ٹی وی پر دیکھا۔ کیا یہ شخص Mobile Salesman ہے؟ —— مگر اس کے پاس جھولا، تھیلا وغیرہ نہیں تھا۔ وہ بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ وہاں سبز طوطوں کی ایک ڈار کمکتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں نے ڈار کو دیکھتے ہوئے پوچھا کہ یہ سکون کیا ہے؟ اسے میرے سوال پر تعجب ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ سکون کے بارے میں تفصیل سے کچھ بتانے لگے، میں نے اسے ٹوک دیا —— بھلے مانس! شام کے اس دھندلکے میں جب دن اور رات گلے مل رہے ہیں، تم کیوں میرے گلے پڑ رہے ہو؟ کیا میں اپنے چہرے بشرے سے بآسانی جھانسے میں آنے والا دکھائی دیتا ہوں؟ اتنے بڑے شہر میں اتنے اتنے لوگوں کے درمیان تم نے مجھے ہی کیوں منتخب کیا؟ کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم کیا بلا ہو؟ سیدھے مطلب پر آؤ اور مجھے جانے دو۔ گھر میں میرا انتظار ہو رہا ہوگا!

اس نے ہنس کر بتایا کہ وہ کئی روز سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے معلوم ہے کہ مجھے سکون کی تلاش ہے اسی لئے میں زندگی کی گہما گہمی سے گھبرا کر باغ میں آتا ہوں۔ میں نے اپنی توند پر ہاتھ پھیر کر بتایا کہ میں اس کے لئے یہاں آتا ہوں۔ اگر تمہارا تعلق کسی یوگ تربیتی مرکز، گائتری سنگھ یار جنیش فاؤنڈیشن سے ہے تو جان لو، میری دلچسپی ایسی باتوں میں نہیں ہے۔ میرا کام ہی میرا ''یوگ'' ہے۔ برائے مہربانی میرا اور اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ Leave me alone!

وہ پھر ہنسا۔ آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ واقعی آپ کو سکون کی تلاش ہے۔ آپ بہت جلد Irritate ہو جاتے ہیں۔ ابھی تو آپ نے مجھے اچھی طرح جانا اور پہچانا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے، آپ کو میری

ضرورت ہے۔

میں نے اپنے دماغ پر زور دیا کہ اس اجنبی کی پہچان کا سراغ مل سکے۔ اس اثنا میں ایک کوا کاؤں کاؤں کرتا میرے سر پر سے گزر گیا۔ تو میں نے اپنے کاندھے پر کچھ گیلا سا محسوس کیا —— کیا پھر ؟ دفعتا میرا ہاتھ کاندھے پر چلا گیا۔ پرندے دور رہ کر بھی اپنی موجودگی کا احساس کرا دیتے ہیں۔ اس کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر مسکرانے لگا —— پرندوں پر کسی قانون کی دفعہ نہیں لگتی۔

مگر تم پر تو لگ سکتی ہے! تھوڑا بہت قانون میں بھی جانتا ہوں۔ تم نے جبرا میری مرضی کے بغیر یہاں بٹھال رکھا ہے۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۳۴۱ کے تم ملزم ہو۔ مجھے یاد نہیں، میں نے پہلے کبھی تمہیں یہاں یا کہیں اور دیکھا ہو۔ تم کہہ رہے تھے کہ میرا انتظار کر رہے تھے ؟ باقی باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے یہ بتاؤ، تم ہو کون ؟ بغیر تعارف کے کسی کے سر پر سوار ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں۔ تم جاسوس یا سی آئی ڈی کے آدمی تو نہیں لگتے بھائی! میں سیدھا سادا آدمی ہوں۔ میرے پیچھے کیوں پڑے ہو ؟ ضرور تمہیں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔

نہیں جناب مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، میں آپ کی ہی تلاش میں تھا —— وہ عجیب قسم کا ڈھیٹ نکلا۔ میری بے رخی اور سرد مہری کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں آپ سے ہی مخاطب ہوں۔ آپ کو سکون کی تلاش ہے اور میں سکون کا سودا کرتا ہوں۔ میرے سودے میں نفع ہی نفع ہے۔ آپ خواہ تسلیم نہ کریں۔

ہمارے سامنے سے چند خوبصورت لڑکیاں گزر گئیں۔ اوپر اڑتی چڑیوں کی چہکار کے ساتھ باغ کی کنکریٹ سڑک پر پھدکتی ان چڑیوں کی چہکار بھی شامل ہو رہی تھی۔ اندھیرے کے خوف سے وہ جلد از جلد اپنے اپنے گھونسلوں میں پہنچ جانا چاہتی تھیں۔ میں حسرت سے انہیں تکا کیا۔ باغیچے کی تازہ اور خوشنما ہوا نے ان کے کھلے کھلے چہروں کو کچھ اور رونق بخش دی تھی۔ تبھی چند بوڑھے اپنے آخرت کے سفر کی تیاری میں اپنے Rutdatal گھٹنوں کو تیل پانی دینے کی جدوجہد میں ہانپتے اور رینگتے ہوئے سامنے سے گزرے۔ میں نے نگاہ پھیر لی۔ میں بڑھاپے کو زیادہ دیر تک نہیں جھیل سکتا۔ جب وہ مجھ پر اترے گا تب دیکھا جائے گا- بھلے آدمی تم جانتے ہو میں کون ہوں ؟

آپ ایک تاجر ہیں اور اپنا نفع نقصان خوب جانتے ہیں۔ وقت کی قدر کرنا بھی۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کیسے پتہ لگایا کہ میں تاجر ہوں۔ اب جان ہی چکے ہو تو برائے مہربانی فورا یہ بھی بتادو کہ

تمہارے پاس سکون کا کتنا اسٹاک ہے اور اس کی کوائلٹی کیا ہے ؟ کوائلٹی جانے بغیر میں کبھی کوئی سودا نہیں کرتا بلکہ بات تک نہیں کرتا کسی سے۔

وہ پھر مسکرایا —— یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نہ صرف مجھ سے بات کر رہے ہیں بلکہ اپنا قیمتی وقت بھی دے رہے ہیں۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میری بات میں دم ہے اور میرے سکون کی کوائلٹی اپنے منہ آپ بول رہی ہے۔ ویسے سکون کا کبھی اسٹاک نہیں کیا جا سکتا۔ بجلی کی طرح اسے تو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ایسا کر لیں گے۔

کیا کر لیں گے ؟

سکون کو حاصل !

تو پھر وہ سکون میرا ہی ہوا نہ کہ تمہارا۔ تم تو سودے کی بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سکون کا سودا کیسے ہو سکتا ہے ؟ تم سکون کے Stockist بھی نہیں ہو، دلال بھی نہیں ہو۔ پھر کیا ہو ؟ میرا خیال تو یہ ہے کہ جتنا بھی سکون اس وقت میرے پاس تھا اسے تم نے ناحق مجھ سے چھین لیا ہے۔

اس بار وہ قدرے زیادہ مسکرایا —— اگر سکون آپ کا ہے تو میں یا کوئی بھی اسے کیسے چھین سکتا ہے ! میں چھیننے نہیں، کچھ دینے آیا تھا۔ آپ تو میری نیت پر بھی شک کر رہے ہیں۔ میں ایسا برا شخص نہیں ہوں۔ کوئی بھی نہیں ہوتا اگر آپ چاق و چوبند ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ ہوش مند نکلے۔ آجکل ہوش مند کم نظر آتے ہیں۔ غرض مند تو بہت مل جاتے ہیں، دیکھئے نا، آپ غرض مند بھی ہیں اور ہوش مند بھی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کو رام کرنا ذرا مشکل ہے۔ پھر بھی کوشش لازمی ہے۔ میں آخری دم تک آپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ BY the way آپ ٹی وی دیکھتے ہیں ؟

ہماری بات کا ٹی وی سے کیا تعلق ہے ؟

تعلق ہے ! —— میں نے پہلی دفعہ اس کے دانتوں کو بغور دیکھا۔ ملگجی اندھیرے میں بھی وہ چمکتے ہوئے نظر آرہے تھے —— حبشیوں کے دندانوں کی مانند یا پھر کسی ٹوتھ پیسٹ کی اشتہاری مسکراہٹ کی طرح جہاں دانتوں کا کلوز اپ پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کھانے کے دانت الگ ہوتے تھے، دکھانے کے الگ۔ آجکل دونوں کا امتیاز مٹ گیا ہے۔ کوئی دانت دکھاتا سامنے آئے تو دل ڈر سے کانپ اٹھتا ہے، کہیں یہ کھانے اور چبانے والے تو نہیں !

آپ نے کبھی غور کیا، بتیسی دکھانے کے بعد وہ آگے بولا، ٹی وی کا کوئی سا چینل لگاؤ، اشتہارات

کی بھر مار آپ کو چڑانے کے لئے ہمہ وقت موجود ہوتی ہے خواہ آپ کی دلچسپی اس میں ہو یا نہیں !وہ دکھاتے چلے جاتے ہیں —— گولیوں کی بوچھار کی طرح تڑاتڑ۔تڑاتڑ۔لو اور لو۔اور۔اور۔وہ آنکھوں کے راستے گھس کر دل میں گھر کر جاتے ہیں —— یہ آج کی Market Value ہے۔Target کو Fix کر لو۔ جانے مت دو۔ پھر دیکھو، کیسے نہیں وہ کھینچا چلا آئے گا —— کچے دھاگے سے بندھا ہوا۔ نفرت کرنے والی عورت سے بھی اگر ہزار بار کہو کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے تو وہ بھی طوطے کی طرح رٹنے لگے گی —— ہاں ہاں —— پیار ہے پیار ہے !! You know جن کے پاس دولت ہوتی ہے وہ آپ کے دماغ کو بھی جھنجھوڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ کوئی حساب لگا کر دکھائے کہ ہر روز ایک سے اشتہارات دکھائے جانے پر کروڑوں افراد کا کتنا قیمتی وقت فضول ضائع ہوتا ہے۔کروڑوں منٹ۔جو وہ اپنے لئے ،اپنے خاندان کے لئے ،اپنے وطن کے لئے ، اپنی دھرتی کے لئے صرف کر سکتے تھے۔عام آدمی کے سکون تو درہم برہم کرنے اور لوٹنے والے ان مہا راکشسوں کے بارے میں کبھی آپ نے غور و فکر کیا ؟ —— نہیں نا ! —— سب یہی مان کر چلتے ہیں کہ it has been part of our life —— کیسی لائف ؟ ملٹی نیشنل کی ادھار دی ہوئی۔ میں آپ کو الرٹ کرنے آیا ہوں۔

ارے واہ!اس بار میں نے ٹھہاکا لگایا —— گویا اتنی دیر سے تم مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہو ؟ بھائی !اگر تم اس معاملے میں اس قدر فکر مند ہو تو اخباروں میں مضامین لکھو، پرچے چھاپ کر تقسیم کرو، میڈیا کا سہارا لو۔ میرے پاس کیوں چلے آئے ہو ؟ فرض کرو، تم مجھے قائل کر لو گے تو ایک اکیلا چنا تو بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا جبکہ ہر کنویں میں بھانگ پڑ چکی ہو۔

آپ صحیح فرما رہے ہیں —— اس نے شال میں لپٹی ادھیڑ عورت کو غور سے تکتے ہوئے کہا، جس کے پیچھے اس کا شوہر (یا کوئی اور) لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا،اس مندر کی جانب جس کا احاطہ پھیلتا جا رہا تھا اور جس کے اطراف کے لان تیزی سے اجڑتے جا رہے تھے۔ان کے اندرون میں زمین کو کھوکھلا بنا دینے والی چونٹیوں کی ایک وسیع دنیا آباد ہو چکی تھی۔ کسی کو اس طرف دھیان دینے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ وہ دیا دھرم کا معاملہ تھا۔

آپ صحیح فرما رہے ہیں۔اس نے دوہرایا —— ایک تنہا شخص کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن شروعات کہیں سے تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ویسے آپ انفرادیت سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ آپ کو معلوم ہوگا، دنیا کی ہر نئی ایجاد اوائل میں کسی واحد شخص کے دماغ کی اپج ہوتی ہے۔ایجادات ہی کیوں۔قومی سدھار کی

تحریکیں، انقلابات، ان سب کی داغ بیل غور و فکر کرنے والے شخص —— ہاں اکیلے شخص کے دماغ میں پڑتی ہے۔ جنگیں بھی انسانی دماغ سے میدان جنگ میں پہنچتی ہیں، رزم ہو یا بزم۔ آغاز پہلے پہل واحد دماغ سے ہوتا ہے، پھر کارواں بنتا جاتا ہے۔ کیوں نہ یہ شروعات ہم دونوں کریں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ آپ جہاں دیدہ اور تجربہ کار بھی ہیں۔ بس، کسی طرح آپ ہاں کہہ دیجئے، پھر دیکھئے ہم کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔

خوشی اور جوش کے مارے اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تیزی سے دبانے لگا تھا۔ مجھے اس کی ایسی ہیجان آمیز حالت دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگی۔ یہ تو درست تھا کہ اس کی باتیں قابل غور تھیں لیکن جس طرح وہ معقول تعارف کے میرے قریب آکے بیٹھا اور اپنی باتوں کا جال بنا، اس سے میرے ذہن میں شک کا ابھرنا لازمی تھا۔

پارک میں اندھیرے نے اپنی چادر تان دی تھی اور بجلی کے قمقمے جل اٹھے تھے۔ مجھے بہت پہلے ہی اپنے گھر میں ہونا چاہئے تھا —— باتھ روم میں —— پھر گرما گرم چائے کی سپ —— ہم کچھ چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں، جو ذرا دیر کے لئے ہی سہی، روح کو تازگی بخشتی ہیں۔ آج میں اس تازگی سے محروم ہو کے رہ گیا تھا۔ گھر لوٹوں گا تو رات کا پہلا پہر میرے دروازے پر موجود ہوگا اور بجلی کی روشنی میں نہاتا نہیں۔ بلب جیسے میرے برہنہ جسم کو منہ چڑانے لگتا ہے۔ شاید ایسا نہ بھی ہوتا ہے مگر عادت جو ٹھہری!

میں اٹھ کھڑا ہوا —— معاف کرنا بھائی! مجھے جانا ہوگا۔ میں اپنے ٹائم ٹیبل کا غلام ہوں۔ تمہاری باتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے لیکن اس وقت نہیں۔ کل یہیں ملیں گے، شام سے پہلے۔ تب تم سے اچھی طرح تعارف بھی ہوگا اور یہ بھی طے ہوگا کہ ہم کیا کر سکتے ہیں، کیا کرنا چاہئے اور کس طرح؟

وہ بیٹھا رہا —— بہتر ہوتا اگر آج ہی سب کچھ طے ہو جاتا۔ ایک بار سرا چھوٹ جاتا ہے تو دوبارہ ہاتھ میں آنے کی گارنٹی نہیں ہوتی۔ لیٹ تو آپ ہو ہی چکے ہیں، میری درخواست ہے آپ کچھ دیر اور بیٹھ جائیں شاید ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ وہ بڑی حسرت سے میری جانب دیکھے جا رہا تھا۔ میرا دل پسیجا کہ کچھ دیر اس کی خاطر اور بیٹھ جاؤں لیکن اگلے ہی لمحے مجھے یہ نرمی فضول لگی۔ ہمیں اپنے ارادوں میں ہمیشہ مضبوط ہونا چاہئے، ایک بار اٹھ گئے سو اٹھ گئے۔ ویسے بھی یہ کوئی گمبھیر معاملہ نہیں تھا۔ آخر آج تک جو کچھ ہو رہا تھا، ہو ہی رہا تھا۔ ہمارے سوچنے، فیصلہ کرنے سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔ سوچنے اور عملی قدم اٹھانے کے

درمیان زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے —— یہ اس شخص کو جاننا چاہئے۔ صرف جوش جنوں سے اس خرابے میں کام نہیں چلتا، ایک طویل، صبر آزما سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ منزل مل ہی جائے۔

Sorry Man جانا ہی ہوگا۔ کل یہیں ملنا! Good By! میں نے ہولے سے قدم بڑھایا، لگا جیسے پیچھے سے وہ میرا دامن کھینچ رہا ہو —— بیٹھ جایئے نا۔

مڑ کر دیکھا۔ اس کی گدلائی آنکھوں میں بے بسی اور لاچارگی تھی جو اس جیسے شخص کی آنکھوں میں نہیں ہونا چاہئے تھی- میں رکا نہیں، بڑھتا چلا گیا۔ پارک وہی تھا، سڑکیں، پگڈنڈیاں، خوشبوئیں وہی تھیں، اگر نہیں تھا تو وہ وقت جس کا میں عادی تھا۔ برس بیت گئے۔ سورج ڈوبنے کے بعد کبھی پارک میں رہا نہیں۔ سب کچھ انجانا سا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اپنے شہر میں نہ ہو کر کسی اور شہر میں ہوں۔ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اب میں عجائب گھر تک پہنچ چکا تھا۔ پھر سر کو گھما کر کن انکھیوں سے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ بدستور وہیں، اسی بنچ پر جما تھا جس پر میرے جسم کی گرمی اب بھی موجود ہوگی، اگر وہ محسوس کرنا چاہے۔ وہ متواتر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔ الوداعی —— یا کل کے وعدے کے لئے۔

آگے موڑ تھا۔ میں مڑ گیا۔ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے ساتھ چل رہا ہے- میرا ہم قدم۔ جوتوں کی مانوس آہٹ- مگر میرے آگے پیچھے دائیں بائیں کوئی نہ تھا۔ دور ایک بنچ پر ایک نوجوان جوڑا سر جوڑے بیٹھا تھا۔ سب سے بے خبر پتہ نہیں کس کس سے دور۔

میں راستے بھر اسی کے بارے میں سوچتا رہا اور گھر پہنچنے کے بعد بھی۔ جو سکون کی بات کرنے آیا تھا، وہ مجھے بے سکونی دے گیا۔ میں اسی لئے سنجیدہ اور بوجھل باتیں کرنے والوں سے ہمیشہ کتراتا ہوں۔ وہ اور کچھ کریں یا نہ کریں، ڈسٹرب ضرور کرتے ہیں- خواہ سکون کے متعلق- سکون کا خون کر کے۔ یوں تو یہ اچھی بات ہے کہ انسان کو غور و فکر کرتے رہنا چاہئے اور اپنی ذمہ داریوں کے تئیں بیدار رہنا چاہئے مگر تمام طاقت جب چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہو تب صرف غور و فکر کرنے سے کیا حاصل ہوگا- سوا سر درد کے جس کو کہ میں ابھی بھگت رہا ہوں۔ مجھے غصہ آنے لگا، بے وجہ ایک اجنبی نے میری شام غارت کر دی۔ ایسے جھکی آدمی سے بچ کر رہنا چاہئے۔ اچھا ہوگا، ایک دو روز پارک کی طرف جاؤں ہی نہیں۔ لیکن کیا میں ایسا کر پاؤں گا؟ میں تو اپنی عادتوں کا غلام ہوں۔ جاؤں گا تو ضرور مگر اس کمبخت سے بچ کر رہوں گا۔

اگلی شام میں نے واقعی ایسا کیا۔ میں دانستہ اس سڑک پر جاتا ٹالتا رہا جہاں بے پشت بنچ پر کل ہم بیٹھے

تھے۔ ممکن وہ آچکا ہو اور مجھے تلاش کر رہا ہو۔ سچی بات یہ بھی تھی کہ میں خود اس کی تلاش میں تھا۔ میری آنکھیں ہی متلاشی نہیں تھیں میرا ذہن بھی اس کے خیال کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کوئی بھی موٹا سا آدمی اس کا مشابہ نظر آتا تو لگتا کہ وہی ہے۔ نزدیک جانے پر یا اچھی طرح نظر آنے کے بعد وہ کوئی اور نکلتا —— یہ کیا ہو رہا تھا؟ – میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ میں اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی کے بارے میں سوچ بھی رہا تھا۔ صرف سوچ ہی نہیں رہا تھا، اس کی تلاش و طلب میں بھی تھا جس طرح ہم کسی دوست کو، کسی معمولی وجہ سے کھو دیتے ہیں اور پھر دوبارہ اس کی قربت حاصل کرنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔

پارک میں ٹہلتے ہوئے مجھے تقریباً پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ روز کی طرح شام کے سائے اترنے لگے تھے۔ میرے لوٹنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اور میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی جیسے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد کوئی خواہش، کوئی طلب باقی رہ جائے —— آپ یقین نہیں کریں گے، میرے قدم آپ ہی آپ اس سڑک پر بڑھ چلے جہاں کل ہم بیٹھے تھے۔ بے پشت بنچ پر وہ سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے میرا انتظار کرتے کرتے تھک چکا ہو۔

میں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ مگر وہ کوئی اور تھا۔ اسی کی طرح موٹی گدگدے جسم والی ایک عورت جھاڑیوں کی طرف سے نمودار ہوئی، اپنے گود کے بچے کا جانگھیا بدل کر آتی ہوئی۔ اس نے بچے کو بغل میں پانی کی گگری کی طرح داب رکھا تھا اور بچہ کھلکھلا رہا تھا جانے اپنی ماں کی گرم و گداز بغل سے یا اپنے پیٹ کے ہلکا ہو جانے سے؟

آدمی ہنسا —— شیطان موقع و محل نہیں دیکھتا۔ اسے ابھی لگی تھی۔

عورت بھی ہنسی —— بچہ ہے! شام کو حاجت ہو ہی جاتی ہے!!

حاجت! —— میرے ذہن میں کھٹکا سا ہوا۔ کیا میں بھی کسی حاجت کے سبب یہاں چلا آیا؟

کل نہیں آؤں گا۔ یہ کیا حماقت ہے۔ کوئی بھی کہیں سے اٹھ کر آئے گا اور اپنے بے سر پیر کی باتوں سے مجھے پریشان کر کے چلا جائے گا؟ مجھے اپنے آپ کو مضبوط بنانا ہوگا، اندرون میں مضبوط۔ کوئی کچھ بھی کہے، اس سے بے تعلق رہنا۔ کل میں یقینی طور پر ادھر نہیں آؤں گا۔ لوٹتے وقت طویل سانس لیتے ہوئے میں نے مصمم ارادہ کر لیا۔

لیکن آپ پھر یقین نہیں کریں گے، میں اگلے روز بھی وہیں تھا اور اس سے اگلی شام بھی —— اس کی تلاش میں۔ مگر وہ کہیں نہیں تھا۔ ایک چھلاوے کی طرح وہ کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ خواب

خیال کی طرح جو آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ـــــ میں کیسا احمق ہوں۔ کم از کم اس پراگندہ شخص کا نام و پتہ تو دریافت کر لینا تھا۔ ادھوری ملاقاتیں اور ادھوری باتیں آسیب کی طرح یا ناکام عشق کی مانند عمر بھر پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ سفر کی یہ نامنزلی کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہے، آپ کو کیا بتاؤں۔ کبھی کبھی تو یوں بھی لگتا ہے کہ میں اس سے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔

☆☆

قاسم خورشید

پورا ہندوستان

[دھیرے دھیرے پردہ کھلتا ہے۔ اسٹیج پر مکمل اندھیرا۔ کافی ڈراونی آواز ابھرتی ہے۔ آواز تیز ہونے لگتی ہے۔ پھر یہی آواز چند لوگوں کے شور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شور دھیرے دھیرے کم ہوتا ہے۔ روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ اسٹیج کے وسطی حصے پر ابھرتا ہے۔ ایک آدمی اسی دائرے میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں اوپر کی طرف ٹکی ہیں۔ دھیرے دھیرے وہ شخص ناظرین کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اچانک رک کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے]

پہلا آدمی —— (اونچی آواز میں) ہندوستان......!

[روشنی کا دائرہ اسٹیج کے بائیں طرف بڑھتا ہے۔ ایک شخص پہلا آدمی سے کچھ دور جاکر ٹھہر جاتا ہے]

دوسرا آدمی —— ......انڈیا......!

[اسی طرح اسٹیج کے دائیں طرف والا آدمی بڑھتا ہے اور تینوں ایک ہی صف میں آکر کھڑے ہو جاتے ہیں]

تیسرا آدمی —— بھارت......!

[روشنی گل ہونے کے ساتھ آواز دب جاتی ہے اور پھر ہلکی روشنی میں بڑھتا ہوا نووارد اسٹیج کے باہری حصے میں آتا ہے]

نووارد —— (ناظرین سے) آپ کو جب جو خواہش ہو بول سکتے ہیں۔ ان ناموں پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ ہم یہی تصور کریں گے۔

[پورے اسٹیج پر روشنی پھیل جاتی ہے۔ ایک ساتھ کئی آوازیں ابھرنے لگتیں ہیں۔ سبھی رقص کرتے ہوئے گاتے ہیں]

چار افراد ——

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہم سایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

(اقبال)

[پھر دھیرے دھیرے اندھیرا۔ چار آدمی مختلف روشنی کے دائرے میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نووارد ناظرین سے مخاطب ہوتا ہے]

نووارد —— ہندو...... سکھ...... عیسائی اور اسلام

یہ سب ان انسانوں کے دھرم ہیں۔ یہاں بہت ساری ہند شیں نہیں مگر......

[اسی وقت ہنگامہ خلا میں گونجنے لگتا ہے، شور بدستور بڑھتا چلا جاتا ہے]

بھیڑ کی آواز ——

جے ہو بجرنگ بلی کی
جے ہو درگا ماتا کی
جے ہو شری گنیش کی

......مارو مسلمین...... کاٹو مسلمین

[دوسری طرف سے آتی ہوئی بھیڑ اسٹیج کے ایک کونے میں جمع ہو کر کہتی ہے]

دوسری بھیڑ —— (تیز آواز میں) نعرہ تکبیر اللہ اکبر

یا علی مدد کر

پہلا آدمی —— (مخالف بھیڑ سے مخاطب ہو کر) یہ کافر ہیں، ماروں ان کو

دوسرا —— ہیں یہ اسلام کے دشمن

تیسرا —— کوئی نہیں اب سہہ پائے گا

چوتھا —— مسجد توڑ نہ رہ پائے گا

[بھیڑ کا تصادم۔ شور بڑھتا جاتا ہے۔ روشنی مدھم ہوتی ہے]

آدمی ۱ —— مندر کو ہے ڈھایا کس نے

آدمی ۲ —— ہم کو کچھ نہیں معلوم

آدمی ۱ —— کیسے دھام میں گولی برسی؟

آدمی ۲ —— ہم کو کچھ نہیں معلوم

آدمی ۱ —— سندھ میں بھی آگ لگائی

آدمی ۲ —— ہم تو ہیں آپس میں بھائی!

آدمی ۳ —— مگر ٹوٹی ہوئی ویران مسجدوں اور ویران گھروں کو کیوں بھول رہے ہو۔

آدمی ۱ —— ہمیں کیا ہے مسجد سے لینا

آدمی ۳ —— خوب کہی۔ آیا تھا بھوکمپ تو دی تھی اسی مسجد نے پناہ۔

[اسی وقت کہیں ویرانے سے اذان کی آواز ابھرتی ہے۔ سب اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔ مگر ذہن کے بند دریچوں پر بھی مقدس آوازیں دستک دیتی ہیں]

اللہ اکبر ...... اللہ اکبر

اشھد ان لا اللہ الااللہ..........

اشھد ان محمد رسول اللہ ....

ایک آواز —— ہم کہتے ہیں۔ یہ اس طرح کچھ نہیں بتائے گا۔

[اسٹیج پر تیزی سے ایک آدمی داخل ہوتا ہے]

آدمی ۴ —— تو پھر انتظار کاہے کا......

[لوگ ایک دوسرے پر حاوی ہوتے ہوئے کہتے ہیں]

بھیڑ کی آواز —— تم ٹھیک کہتے ہو

مارو مسلمین......کاٹو مسلمین

ایک کے بدلے تین...... تین

مارو مسلمین......

دوسری بھیڑ —— نعرہ تکبیر اللہ اکبر

یا علی مدد کر

کافر ہیں یہ مارو ان کو

تصادم کے دوران آوازیں ابھرتی ہیں۔ روشنی آواز کی لے پر بدلتی رہتی ہے۔ کوئی آہ......

کوئی مارو...... اور پھر......]

آدمی ۱ —— تو ہی ہے سالا۔

آدمی ۲ —— نہیں بھیا نردوش ہوں میں۔ بات ہماری مانو بھیا۔

آدمی ۳ —— کیسے مانوں؟ تو نے بت توڑے ہیں۔ مندر ڈھائے۔

آدمی ۴ —— اے بھیا ہم کو کچھ معلوم نہیں ہے۔

آدمی ۳ —— اب پستول کی بھاشا سیکھ۔ [پستول چلاتا ہے]

آدمی ۴ —— ہے رام۔ تو نے مجھ کو کاہے مارا......

آدمی ۵ —— کون بچائے گا اب تجھ کو۔ تو نے میرے بھائی کو مارا۔ ہمت ہے تو بھڑ جاؤ۔ دیکھتا ہوں کتنا بل ہے تمہاری پنڈلیوں میں۔

آدمی ۶ —— ہم کو چھوڑ دو بابو ہم نردوش ہیں۔

آدمی ۵ —— کیوں چھوڑ دوں۔ تو نے مسجدوں کو شہید کیا ہے۔

آدمی ۶ —— ہم اپنے بچوں کی قسم کھا سکتے ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں کیا ہے۔

پہلی بھیڑ —— تو کیوں آئے ہو اس بھیڑ کی شکل میں۔

آدمی ۶ —— (تعجب خیز لہجے میں) یہ تم ہم سے کہہ رہے ہو؟ ارے میں تو سکھ چین کی نیند سو رہا تھا۔ مجھ کو کچھ لوگ یہاں لائے ہیں، سبھوں نے کہا کہ شہر میں دنگا ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ میرے گھر کو جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بھیڑ کی آواز —— چوہے! تمہارے بھائی مر رہے تھے اور تو آرام سے گھر میں سو رہا تھا۔

باہری آواز —— کتنی دیر تک پوچھو گے ان سے۔ میں کہتا ہوں مارو ان کو۔ کتنے بے شرم ہو تم لوگ۔

انہوں نے تمہاری عبادت گاہوں کو تباہ کیا اور تم ہو کہ ان کا منھ تک رہے ہو۔

آدمی ۵ —— ہاں ہم کب تک ظلم برداشت کرتے رہیں گے۔ میں کہتا ہوں مارو ان کو مسلم بچو!

[بھیڑ کا تصادم]

ایک آدمی —— نہیں...... مت بڑھو، ہم کہتے ہیں آہ...... ہے رام...... یا علی...... بچاؤ...... کوئی بچاؤ مجھ کو۔

[اسٹیج پر روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ پھر اور ہلکی روشنی۔ ایک بوڑھا فقیر لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا آتا ہے۔ ایک آدمی اس کا تعاقب کرتے ہوئے]

آدمی ۱ —— (بوڑھے سے) تونے میرے بھائی کو مار ہی ڈالا

بوڑھا —— دیکھو میں کتنا بوڑھا ہوں۔ صرف لاٹھی کے سہارے ہی چل سکتا ہوں۔ میرے پیٹ میں دانا نہیں ہے اس لئے بھوکا اس سڑک پر آگیا ہوں۔ بیٹا ابھی میں تو سب کے جینے کی دعا کروں گا۔ میری روٹی پر ہر دھرم کی آستھا ہے۔

باہری آواز —— یہ ڈھونگی ہے۔ موت سے ڈرتا ہے یہ۔ دیکھتا کیا ہے، مارو اس کو۔

بوڑھا —— مت بڑھو گے آگے۔ مجھ فقیر پر ظلم مت کرو۔ ارے میں تو سب کا بھائی ہوں۔

آدمی ۱ —— (بوڑھے فقیر کو زمین پر گرا کر) تو ڈھونگی ہے ہم تیری جان لے کر ہی چھوڑیں گے۔

بوڑھا —— (سہم کر) دیکھو...... دیکھو...... آہ...... بس...... نہیں...... روٹی دو بابو...... ہائے ہائے کس بے دردی سے مارا...... ہے رام...... یا مولا...... مدد...... واہے گرو......

[اسٹیج پر اندھیرا۔ بھیڑ کی آواز ابھرنے کے ساتھ ہلکی روشنی پھیلتی ہے]

بھیڑ کی آواز —— مارو مسلمین...... کاٹو مسلمین

ایک کے بدلے تین تین......

مارو مسلمین......

دوسری بھیڑ —— نعرہ تکبیر...... اللہ اکبر

یا علی مدد کر......

بڑھ جائے اسلام کی شان

جو ہم لیں کافر کی جان......

[سائرن کی آواز۔ اسٹیج پر بھاگ دوڑ۔ پھر سناٹا۔ مدھم روشنی میں ایک پولیس اسٹیج پر آکر

اعلان کرتا ہے]

پولیس —— ایک ضروری اعلان...... ایک ضروری اعلان۔ اس شہر میں رہنے والوں کو سوچنا دی جاتی ہے کہ آج صبح سات بجے سے شام چھ بجے اور شام سات بجے سے کل صبح چھ بجے تک کرفیو لگادیا گیا ہے۔ اگر اس دوران کسی کو بھی سڑک پر گھومتے یا گھروں سے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے پایا گیا تو گولی ماردی جائے گی۔ ایک ضروری اعلان......

[اعلان کرتا ہوا پولیس کا آدمی اسٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔ اسی دوران ایک آٹھ سالہ بچہ سہما ہوا اسٹیج پر آتا ہے۔ پولیس تیزی سے اس بچے کے پاس جاتی ہے]

پولیس —— (چیختے ہوئے) کون ہو تم......

بچہ —— میں منا ہوں۔

پولیس —— تو یہاں کیا کر رہا ہے۔

بچہ —— (بلکتے ہوئے) مجھے چھوڑ دو۔ ماں بیمار ہے۔ پڑوسی کے یہاں سے پیسے لینے جارہا ہوں۔ دوالانی ہے

پولیس —— حرامزادے۔ تجھے معلوم نہیں شہر میں کرفیو لگادیا گیا ہے۔ کسی کو سڑک پر گھومتے ہوئے دیکھتے ہی گولی ماردینے کا آدیش ہے۔

بچہ —— (روتے ہوئے) مجھے مت مارو۔ میں چور نہیں ہوں۔ منا چور نہیں ہے۔

پولیس —— ارے او منا کے بچے۔ تیری ماں نے تجھے جان بوجھ کر سڑکوں پر کیوں بھیجا۔

بچہ —— سپاہی جی۔ جب میں گھر سے چلا تھا تو اس وقت کرفیو نہیں لگا تھا۔ سب لوگ سڑک پر گھوم رہے تھے۔ میں دوالے کر نہیں لوٹا تو وہ غصہ ہو جائے گی۔

پولیس —— تیری ماں بعد میں غصہ ہوگی۔ یہ پستول دیکھ رہا ہے نا۔ میں تجھے ختم کردوں گا (ڈانٹتے ہوئے) میں کہتا ہوں بھاگ یہاں سے سالا۔ جلدی بھاگ۔

[منا سہم کر اسٹیج سے باہر جانے لگتا ہے کہ اس پر پستول چل جاتی ہے۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر جاتا ہے]

بچہ —— (چیختے ہوئے) اماں...... اماں...... سپاہی جی...... وہ دیکھو...... اماں......

[بچہ دم توڑ دیتا ہے]

پولیس —— (تعجب سے) میں نے پستول نہیں چلائی! اس بچے کو کس نے مار ڈالا......؟

[کہیں دھب ...... دھب کی آواز۔ وہ اسٹیج پر ادھر ادھر دوڑنے لگتا ہے۔ پھر خلا میں آوز گونجتی ہے]

پولیس —— پکڑو...... پکڑو...... خون...... خون...... کسی نے منا کا خون کر دیا۔ پکڑو......

[لمحے بھر کے لئے اندھیرا۔ پھر روشنی پھیلتے ہی ایک نیتا نما شخص اسٹیج پر داخل ہوتا ہے۔ چند افراد پہلے سے منتظر ہوتے ہیں۔ نیتا کے آتے ہی نعرہ لگایا جاتا ہے۔ وہ انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکتا ہے پھر میٹنگ شروع ہوتی ہے]

نیتا —— (دانت نکال کر) سب سے پہلے تو میں شو شنکر بابو کا ابھاری ہوں کہ انہوں نے مجھے اوشیکھ بنایا۔ ان کے ساتھ میں آپ سب کے پرتی بھی آبھار ویکت کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں اب صاف شبدوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوؤں پر اتیاچار کیا جا رہا ہے آخر اس کا کارن کیا ہے؟

آدمی ۱ —— آپ جیسے لوگ ہی اس دنگے کا کارن ہیں۔

نیتا —— یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں

شو شنکر —— (آدمی ا کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے) تمہیں بیچ میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو منھ میں آتا ہے بک جاتے ہو۔ تم نیتا جی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ یہ ہمیشہ ہمارے آڑے وقت پر کام آئے ہیں۔ شہر میں کرفیو لگا ہے پھر بھی یہ جان پر کھیل کر ہمارے بیچ آئے ہیں۔ دھرم کی رچھا کے لئے اپنی اُور سے انہوں نے سینکڑوں نوجوانوں کو ترشول دیا ہے۔

آدمی ۲ —— ترشول یا تلوار سے ڈر پھیلے گا دھرم نہیں۔

شو شنکر —— تو اپوزیشن سے مل گیا ہے کیا؟

نیتا —— اب آپس میں جھگڑنے کا سمئے نہیں ہے۔ یہ سب بچہ ہے۔ ان پر گرم ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ بیٹا۔ ہم تمہارا کنفیوژن دور کر دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں بیٹھ جاؤ۔

[شو شنکر کے ساتھ آدمی ا اور ۲ بیٹھ جاتے ہیں۔ نیتا جی آگے اپنی بات جاری رکھتے ہیں]

نیتا —— بھائیو! میں آپ کے سامنے بھاشن دینے نہیں آیا ہوں بلکہ مسلمانوں کے ظلم کے بارے میں آپ کو کچھ بتانے آیا ہوں۔ یدھ تو ان کی پرمپرا رہی ہے۔ امن سے رہنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ آپ نے کہیں کہیں موٹے اکھروں میں لکھا ہوا دیکھا ہوگا —— ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد'' —— ارے بھائی آپ اسلام زندہ کیجئے میں بولنے والا کون ہوتا ہوں۔ مگر زبردستی آپ ہم پر حکومت کرنا چاہیں گے تو ہم

سہن نہیں کر پائیں گے۔ کیا ہمیں آزادی اسی لئے ملی ہے!

ایک بوڑھا —— (ٹوکتے ہوئے) نیتاجی آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔

نیتا —— آپ پوجنیہ ہیں۔ ضرور بولئے۔

بوڑھا —— ۴۷ء کی جنگ مجھے یاد ہے۔ بھارت کیسے آزاد ہوا یہ بھی میں جانتا ہوں۔ سبھی کہتے ہیں دنگا کروانے میں انگریزوں نے پہل کی تھی۔ اب انہیں ہم نے بھگا دیا لیکن اس کے باوجود آزادی کے بعد زیادہ دنگے ہوئے ہیں اور آگے بھی ہوں گے۔ ایک اور اگر اس دنگے نے میرا پورا پریوار چھین لیا تو دوسری اور یہ بھی سچ ہے کہ ایک غریب مسلمان کے گھر میں پلا بڑھا ہوں۔ ان لوگوں کی محبت کو آپ کون سا نام دینا چاہیں گے۔ دنگائیوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ نیتاجی آپ لاش کی راج نیتی نہ کریں۔ کیول آپ لوگ ہمارے راستے سے ہٹ جائیں تو محبت اپنی خوشبو خود پھیلا دے گی۔

نیتا —— بیرو کاکا۔ آپ بہت بھولے ہیں آپ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا ہے پھر بھی آپ بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ چھی...... چھی...... چھی...... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔

[اسی وقت شوشنکر کھڑا ہو کر کہتا ہے]

شوشنکر —— جو بھی ہو ہم اتیاچار نہیں سہیں گے۔ ہم بدلہ لے کر رہیں گے۔ بیرو کاکا نے سوگ میں مانسک سنتولن کھو دیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ دھرم سبھا میں بھاگ لینے والے یاتریوں کو چلتی ٹرین میں کس نے جلایا ہے۔

بوڑھا —— جلنے والے تو معصوم تھے ہی مگر ان سے زیادہ سنکھیا میں بعد میں جو لوگ مارے گئے وہ بھی ایک دم نردوش تھے۔ مجھے کوئی یہ بتائے کہ چناؤ کے آس پاس ہی زیادہ تر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ چناؤ کے بعد ستا میں آتے ہی شانتی کیوں ہو جاتی ہے۔

شوشنکر —— اب آپ دلالی مت کیجئے۔ ایک دم چپ رہئے۔

نیتا —— دیکھئے ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے اچھا برا سمجھ میں نہیں آتا۔ میرے وچار سے انہیں گھر میں آرام کرنا چاہئے۔ بس......!

آدمی ا —— (نیتا سے) آپ ان کی بھاونا کا مذاق اڑا رہے ہیں؟ آپ سچ مچ ہمارے بیچ پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایسے......

شوشنکر —— (بیچ میں) اب چپ بھی ہو جاؤ۔ یہ میٹنگ میرے گھر میں بلائی گئی ہے۔ صرف اس لئے کہ

نیتاجی ہمیں بجھاؤ دیں۔ کچھ لوگ اس بیٹھک کو بھنگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم ان سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتے ہیں کہ نیتاجی کو بولنے دیں۔

نیتا —— ہے...... ہے...... اپوزیشن نے بہت وش بھر دیا ہے۔ اسلئے بہت محنت کرنی پڑے گی۔ ہمارے پاس اتنا سمئے نہیں ہے کہ باریکیوں کو سمجھاتا پھروں۔ ساتھیو! آپ سوچیں بھارت میں جتنی مسجدیں ہیں پاکستان میں اتنے مندر کیوں نہیں ہیں؟ آپ دیکھیں کہ بھارت کے لوگ مسلمانوں کو یہاں رہنے کی اجازت دیتے ہیں ان کی عزت بھی کی جاتی ہے ہم بڑا بڑا عہدہ بھی دے ڈالتے ہیں، مگر پاکستان میں تو ہندوؤں کے سامنے آتنک پھیلا دیا گیا ہے۔

بوڑھا —— نیتا جی آپ زہر پھیلا رہے ہیں۔ جو ہندو یا مسلمان دیش کے وبھاجن کے خلاف تھا۔ اس نے اپنی زمین نہیں چھوڑی۔ چاہے وہ کہیں بسا ہو۔

نیتا —— (غصے میں) آپ چپ ہو جائیے۔ بات پوری کرنے دیجئے پھر بولئے گا۔

ہاں تو ٹیمپو بریک ہو جاتا ہے...... میں کہہ رہا تھا کہ یہاں جتنی آزادی سے مسجد بنائی جاتی ہے وہاں ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم نے بھی سوچ لیا ہے کہ جہاں کہیں موقع ملے گا ہم اپنے دھروہر کی رکچھا ضرور کریں گے۔ بھلا سوچئے! رام جی کی جنم بھومی پر ہی ان کے شاسکوں نے مسجد بنوا دی۔ اگر ہم اس دھروہر کو نہیں مٹاتے تو شری رام کے آگے کیا منھ لے کر جاتے۔ ہے رام......! ہم نے دھرم کی رکچھا کی ہے۔ جو رکت بہا ہے وہ تجھ کو سمرپت ہے......

[اسٹیج پر اندھیرا۔ کچھ دیر کے لئے کردار فریز ہو جاتے ہیں۔ دوسرے حصے میں روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ۔ تین افراد گنگنا رہے ہیں]

تین افراد ——

"رام بن واس سے جب لوٹ کے گھر میں آئے
یاد جنگل بہت آیا جو نگر میں آئے
رقص دیوانگی آنگن میں جو دیکھا ہوگا
چھ دسمبر کو شری رام نے سوچا ہوگا
اتنے دیوانے مرے گھر میں کیسے آئے
پاؤں سرجو میں ابھی رام نے دھوئے بھی نہ تھے

کہ نظر آئے وہاں خون کے گہرے دھبے
پاؤں دھوئے بنا سرجو کے کنارے سے اٹھے
رام یہ کہتے ہوئے اپنے دوارے سے اٹھے
راجدھانی کی فضا آئی نہیں راس مجھے
چھ دسمبر کو ملا دوسرا بن باس مجھے ......"

[کیفی اعظمی]

[اسٹیج پر دھیرے دھیرے مکمل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پھر روشنی کے بڑے دائرے میں تنہا بوڑھا بیروکاکا دھیرے دھیرے چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دو غنڈے ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ بیروکاکا اپنی دھن میں ہوتے ہیں کہ اچانک پیچھے سے غنڈے دبوچ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے سینے میں خنجر اتار دیا جاتا ہے۔ بیروکاکا کی چیخ مختلف روشنیوں میں گڈمڈ ہو جاتی ہے اور پھر اسٹیج پر اندھیرا۔ روشنی آتے ہی ایک پولیس والا اعلان کرتا ہوا نظر آتا ہے]

پولیس —— اس شہر کے تمام لوگوں کو سوچنا دی جاتی ہے کہ پچھلے تین دنوں سے شہر میں شانتی ہے اس لئے کرفیو میں ڈھیل دی جارہی ہے۔ اب کیول رات کے دس بجے سے صبح پانچ بجے تک کرفیو لگا رہے گا۔ شہر کی تمام دکانیں کھول دی جائیں۔ سبھی اپنے اپنے کام پر جائیں۔ اگر کسی کے پاس اوزار یا ہتھیار پکڑا گیا تو اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی...... ایک ضروری اعلان...... ایک ضروری اعلان......

[یہ کہتے ہوئے پولیس والا اسٹیج کے باہر چلا جاتا ہے۔ نیتا ٹوپی بدل کر اسٹیج پر داخل ہوتا ہے۔ چند مسلمان ایک ٹولی بنا کر وہاں جمع ہو جاتے ہیں]

نیتا —— ہے...... ہے...... میں جانتا ہوں اس شہر میں یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا محلّہ ہے۔ یہاں کے مسلمان بہت امن پسند ہیں۔ یہ لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ دور رہتے ہیں لیکن میرے دوستو! جب ظلم حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک نوجوان —— آپ چاہتے ہیں کہ ہم ہندوؤں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ لیکن ہم اپنے بھائیوں کا کیوں کر خون بہائیں؟

نیتا —— یہی نادانی آپ لوگوں کو روز بروز توڑے جارہی ہے۔ مجھے کیا پڑی ہے؟ آپ تباہ ہو جائیں۔ برباد ہو

جائیں۔

نوجوان —— آپ سے زیادہ ہم اس محلے کے لوگوں سے واقف ہیں۔ ہمیں کچھ بھی سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

[ایک داڑھی والے مولوی سختی سے نوجوان کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں]

مولوی —— ارے بھئی...... نیتا جی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ کم بخت ہندوؤں نے ہمیں تباہ کیا ہے۔ ہماری بچیوں کو برہنہ کیا ہے۔ بیٹیوں کے پستان کاٹ کر انہیں سربازار بھی رسوا کیا ہے۔ بوڑھوں اور بچوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔ اور اس پر بھی ہم ان سے بدلہ نہ لیں۔ لعنت ہے ہم پر......

نوجوان —— ابا جان...... آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے ہی یہ سب کیا ہے۔

مولوی —— بے شک ان لوگوں نے ہی کیا ہے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں۔ ہمیں کسی بھی قیمت پر چین سے نہیں رہنے دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس دیش سے بھی اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ کبھی پاکستانی کہہ کر، کبھی بنگلہ دیشی بنا کر اور کبھی غدار کہہ کر۔ ہمارا بچہ بچہ ان سے بدلہ لے گا۔ انہیں معلوم نہیں کہ ساری دنیا میں ہماری کتنی بڑی آبادی ہے۔

نوجوان —— کیا بات ہے ابا! آپ کی جب یہ سوچ ہے تو ہمیں کون راہ دکھائے گا۔

نیتا —— ارے آپس میں کیوں الجھ رہے ہو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے اور بھی......

مولوی —— (بیچ میں) نہیں نیتا جی اسے سمجھانا ضروری ہے۔ اس نے کیا دیکھا ہے؟ ہم نے جو سہا ہے۔ ان کی بربریت دیکھی ہے۔

نوجوان —— آپ گنیش چاچا کی مثال کیوں نہیں پیش کر رہے۔ جس نے قرض لے کر آپ کی بیٹیوں کی شادی میں مدد کی تھی۔ آپ رام دین بھائی کے بارے میں کیوں نہیں کہہ رہے، جو ہمیں خون نہیں دیتے تو شاید آج میں زندہ بھی نہیں ہوتا- آپ جیسے ذہن کے ملا اور پنڈت کی اس دیش میں ضرورت نہیں ہے۔

مولوی —— (غصے میں) کیا بک رہے ہو۔ تو ہم سے بدتمیزی سے پیش آرہا ہے۔ آج میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایسی اولاد کا رہنا نہ رہنا دونوں برابر ہے۔

[یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب نوجوان کی طرف لپکتے ہیں کہ نیتا جی بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہتے ہیں]

نیتا —— یہی وجہ ہے کہ آپ کبھی لڑائی نہیں جیت پاتے ہیں۔ اپوزیشن نے کیسا زہر بھر دیا ہے۔ اب

تو اللہ ہی آپ لوگوں کو بچا سکتا ہے۔

مولوی —— کالے استاد اس کمینے (نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سے کہہ دو کہ یہاں سے چلا جائے۔ ورنہ میں اس کا خون کردوں گا۔

نوجوان —— ابھی تو آپ ہندوؤں کو دوشی ٹھہرا رہے تھے لیکن آپ کے ضمیر کو کیا ہو گیا۔ آپ اپنے بیٹے کی گردن دبانے پر آمادہ ہو سکتے ہیں تو دوسروں کے بارے میں کچھ سوچنا ہی فضول ہے۔

نیتا —— اس بد تمیز آدمی کو یہاں سے جانے کے لئے کہا جائے۔

مولوی —— کالے استاد تم (نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں اتنا کمینہ نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے صرف اپنے باپ کو بے عزت نہیں کیا ہے بلکہ نیتا جی کی بھی بے عزتی کی ہے۔ میں کہتا ہوں چلے جاؤ یہاں سے۔

نوجوان —— میں تھوکتا ہوں ایسی جگہ کو۔ دیکھتا ہوں کس طرح آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

[نوجوان پاؤں پٹختا ہوا اسٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔ نیتا جی پھر اپنی بات شروع کرتے ہیں]

نیتا —— کالے استاد، اتنا بھی خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوسائٹی میں اس طرح کے اینٹی سوشل ایلمنٹس تو رہتے ہی ہیں۔

کالے استاد —— نیتا جی ہم شرمندہ ہیں کہ ہماری وجہ سے آپ کو کافی تکلیف پہنچی۔ اور ہم......

نیتا —— (بات کاٹتے ہوئے) ہے...... ہے...... ہے...... میں تو اس طرح کی تکلیف اٹھانے کا عادی ہو چکا ہوں۔ انصاف دلانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

مولوی —— میں بھی اپنے کئے پر شرمندہ ہوں۔ کیا کروں؟

نیتا —— دیکھئے مولوی صاحب یہ نئی بات نہیں ہے اکثر ولی کے گھر میں شیطان پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ اس لئے اب آپ دھیان سے میری باتیں سنیں۔ ہمیں سب سے پہلے آپس میں اتحاد قائم کرنا ہوگا۔ اگر ہم دشمنوں کو مات دینا چاہتے ہیں تو کسی کے بھکاوے میں نہیں آنا ہوگا۔ کچھ لوگ پروگریسو بن کر آپ کو کمزور کرنے کی سازش رچ رہے ہیں۔ کوئی مہاتماؤں کی وانی سنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جب دنگا ہوتا ہے تو سب چوہے کی طرح بل کے اندر چلے جاتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ ہندو دھرم کے کٹر پنتھی لوگ جو نیچی ذات والوں سے دل سے نفرت کرتے ہیں کبھی ایک کنویں سے پانی نہیں پینے دیا، کبھی ایک مندر میں پوجنے نہیں دیا، اب ووٹ کے لئے انہیں بلی کا بکرا بنا کر آپ کے خلاف

کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ الکشن جیتنے کے بعد پھر سے ان کی نفرت جاگ اٹھے گی۔ مگر کوئی انہیں کیسے سمجھائے کہ صدیوں سے نفرت پالنے والے لوگ کیا ایک دن میں بدل سکتے ہیں (تالیاں) دوسری طرف ہمارے مذہب کی روایت اور اس کی پہچان کو مٹانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ ہم اپنی عورتوں کو برقع پہننے کے لئے کہتے ہیں تو ایک طبقہ اس کی بھی مخالفت کر رہا ہے۔ آخر کیوں؟ دوستو! ایک لیڈر کے ساتھ میں کٹر ہندوؤں کی ایک میٹنگ میں گیا تھا۔ وہاں یہ بات ہو رہی تھی کہ اسلامی ممالک میں مندر نہیں کے برابر ہیں اور ہمارے دیش بھارت میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے محلے ہیں۔ میں کہتا ہوں بھائی! کیوں نہ رہیں ہم زندہ قوم کے لوگ ہیں۔ ہم چاہیں تو انہیں برباد کر سکتے ہیں، تباہ کر سکتے ہیں (تالیاں) دوستو! میں دنگے سے بہت ڈرتا ہوں۔ مگر دشمن مجبور کرے گا تو ہم چین سے سو بھی نہیں سکتے۔ آپ مٹھی بھر سکھوں سے مقابلہ نہیں کر سکے تو اس دیش کی دوسری بڑی آبادی سے کیا مقابلہ کر سکتے ہیں (تالیاں) یہ سچ ہے کہ اسلام کربلا کے بعد ہی زندہ ہوتا ہے (تالیاں) اتنی تباہی اور بربادی کے بعد میں آپ لوگوں سے یہی کہوں گا کہ آپ اپنے دشمنوں کا سر کچل ڈالئے۔ مجھے ایک ریلائبل سورس سے پتہ چلا ہے کہ کل کٹر ہندوؤں کی بڑی تعداد آپ کے محلے پر حملہ کرے گی۔ دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کے لئے آپ کو ہوشیار رہنا ہوگا۔ میں آپ کو ہر طرح کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں..... (تالیاں)

کچھ لوگ —— ہم سب تیار ہیں۔ بے شک ہم ان سے بدلا لیں گے۔

ایک بوڑھا —— (بھرائی آواز میں) میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں اپنی جوان بیٹیوں کی عزت لوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت ظلم کئے ہیں۔ آج نہ میری بیوی ہے نہ بیٹی نہ بہن۔ سبھوں نے خودکشی کر لی۔ اس لئے میں بوڑھا ہو کر بھی طئے کر چکا ہوں کہ میرے گھر کو تباہ کرنے والے دشمنوں کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔ نیتاجی! یہ رہی زیورات کی گٹھری۔ میرے پاس جو کچھ بچا ہے میں لے کر آیا ہوں، آپ میری مدد کیجئے۔ کمینوں کا جب تک میں خون بہتے نہیں دیکھوں گا شاید چین سے مر بھی نہیں سکوں گا۔ بولو میرے مسلم بچو! نعرہ تکبیر اللہ اکبر..... یا علی مدد کر..... نعرہ.....

نیتا —— (گھبرا کر) اوہو..... ہو..... یہ سب آپ کیا کر رہے ہیں۔ کوئی شور سن کر آپ پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ کوئی بہادری نہیں ہے۔ اب خاموشی سے وار کرنے کی ضرورت ہے۔

[تمام لوگوں پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی نیتاجی کے ہاتھ میں

ایک اور گھڑی دیتے ہوئے کہتا ہے]

ادھیڑ عمر آدمی ــــــ حضور میرا سب کچھ اب قوم کی خدمت کے لئے ہے۔ آپ ہماری مدد کر رہے ہیں۔ جو بھی راہ دکھائیں گے ہمیں منظور ہے۔

[نیتا جی ہاتھ سے ابھیوادن کرتے ہیں۔ کالے خان کی طرف پوٹلی وغیرہ بڑھا دیتے ہیں۔ کالے خان اپنے چیلے کو یہ سب دیتا جاتا ہے اور پھر کہتا ہے]

کالے خان ــــــ ہمارے بھائی لوگوں نے مالی تعاون دیا ہے۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ جمن میاں کے جذبات کی داد دوں گا۔ انہوں نے ہم سے روپے قرض لے کر اس لڑائی کی تیاری کے لئے دیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ اسی جذبے کی ضرورت ہے۔ آزادی بھی ایسے ہی حاصل کی گئی تھی۔ اب میں اپنی طرف سے ایک لاکھ روپیہ چندہ دینے کا اعلان کرتا ہوں (تالیاں) اس لڑائی میں اور بھی جو خرچ ہوگا میں اس کے لئے تیار ہوں۔ لیکن ہم نیتا جی کی مدد لئے بغیر ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتے ہیں۔ بھائیو! ہمارا نیتا کیسا ہو ؟

آوازیں ــــــ شنکر خان جیسا ہو۔

شنکر خان زندہ باد

شنکر خان امر رہیں

[شنکر خان ابھیوادن سویکار کرتے ہیں۔ اسٹیج پر دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا ہے۔ مدھم روشنی کے ایک دائرے میں ابھرتے ہی ایک پنڈت نما شخص ہاتھ میں ترشول لئے آتا ہے اس کے ساتھ کچھ اور افراد ہاتھوں میں ترشول لئے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر فریز ہو جاتے ہیں۔ اسٹیج کے دوسرے کونے میں روشنی کے ایسے ہی دائرے میں مولوی نما آدمی کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار ہے۔ ساتھ میں کچھ اور افراد ہیں۔ سبھی فریز ہوتے ہیں کہ بیچ میں نیتا جی آکر زور زور سے سیٹی بجاتے ہیں۔ دونوں بھیڑ حرکت میں آتی ہے۔ نیتا جی تیزی سے بھاگ جاتے ہیں اور بھیڑ کی آوازیں ابھرنے لگتیں ہیں]

پہلی بھیڑ ــــــ

جے ہو بجرنگ بلی کی

جے ہو درگا ماتا کی

جے ہو شری گنیش کی

جے ہو شری رام کی

مارو مسلمیں کاٹو مسلمیں
ایک کے بدلے تین تین
مارو مسلمین......

دوسری بھیڑ ——

نعرہ تکبیر اللہ اکبر
یا علی مدد کر
ہیں یہ کافر دشمن میرے
کون انہیں برداشت کرے گا
پل جاؤ اۓ مسلم بچو!

پہلی بھیڑ ——

ہم بھی کچھ کمزور نہیں ہیں
پر تیری طرح منہ زور نہیں ہیں
بدلہ تو ہم لے کر رہیں گے
تم ہو اپنے آگے ھین
ہم کہتے ہیں

مارو مسلمین کاٹو مسلمین
ایک کے بدلے تین تین
مارو مسلمین......

[دونوں بھیڑ ایک دوسرے پر پل پڑتی ہے۔ چیختے پکارتے اور کراہتے ہوئے لوگ دھم دھم زمین پر گرتے ہیں۔ روشنیاں آپس میں گڈمڈ ہوتی ہیں۔ چیخنے کراہنے کی آواز بہ دستور جاری رہتی ہے۔ چند لمحوں تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اندھیرا بڑھنے کے بعد کہیں سے پھر ہلکی روشنی پھوٹتی ہے۔ پھر یہ روشنی تیز ہونے لگتی ہے۔ خون سے لت پت لوگ زمین پر کراہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تبھی پریشانی کے عالم میں نیتا جی اسٹیج پر آتے ہیں]

نیتا —— ہائے کس بے دردی سے ظالموں نے مارا ہے۔ لگتا ہے اس دیش میں جان کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے۔

زخمی نمبر ا —— جن لوگوں نے ہمیں مارا ہے ہم انہیں...... آہ...... آہ......

زخمی نمبر ۲ —— میں گھر پر اپنے بچوں کو پڑھا رہا تھا۔ شور سن کر باہر آیا اور یہ حالت ہو گئی...... او...... ہو...... ہو...... یا اللہ......

زخمی نمبر ۳ —— مجھے بچا لیجئے نیتا جی! میں بہت غریب ہوں۔ میری دو جوان بیٹیاں ہیں۔ میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔ میں اپنی دکان سے لوٹ رہا تھا کہ لوگوں نے حملہ کر دیا...... ہے رام...... ہائے......

زخمی نمبر ۴ —— حضور دشمنوں نے میری جوان بیٹی کا اغوا کر لیا ہے۔ پولیس والے بھی ان کے ساتھ ہیں۔ میری لڑکی کا نام زینت ہے۔ اس کی آبرو بچائیے۔ میرے نردوش بیٹے کو بھی آتنک وادی کہہ کر مار ڈالا گیا ہے۔ کوئی میری مدد کرے۔ یا اللہ۔

زخمی نمبر ۵ —— (آٹھ سالہ بچہ) بابا بھی مر گئے۔ ہم بھی مر جائیں گے۔ مجھ کو بابا کے پاس لے چلئے۔ بابا مجھے گھر میں کہانی سنا رہے تھے۔ انہوں نے کہا ڈاکو آئے...... ڈاکو آئے...... اور سچ مچ گھر کے اندر ڈاکو آگئے۔ انہوں نے سب کو مار ڈالا۔ مجھے اماں کے پاس ہی لے چلو...... آہ...... آہ......

[پھر گہرا سناٹا چھا جاتا ہے۔ نیتا اپنے گارڈ کے ساتھ ہے]

نیتا —— (اپنے گارڈ سے) انہیں ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کیا جائے۔ بھلا اس طرح اتیاچار کیا جاتا ہے کہ شکل بھی نہیں پہچانی جا رہی ہے۔ پارلیامنٹ میں ہنگامہ کھڑا کر دوں گا۔ کسی کو چھوڑوں گا نہیں (پھر گارڈ سے) ارے منہ کیا تاک رہا ہے۔ انہیں ہاسپٹل لے جانے کا انتظام کرو۔

گارڈ —— حضور! اب ان میں کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔ انہیں ہاسپٹل لے جا کر کیا کریں گے۔

[تیز موسیقی کے ساتھ روشنی گل ہو جاتی ہے۔ چند ساعتوں کے بعد اسٹیج پر دونوں دھرموں کے ماننے والے افراد سر جھکائے ہوئے کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ مولانا اور مہنت ایک ساتھ ان کے بیچ آتے ہیں۔ سبھی احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں]

مولانا —— دیکھئے ہم نے یہ میٹنگ امن قائم کرنے کے لئے بلائی ہے۔ مہنت جی بھی ہمارے بیچ آئے ہیں۔ جو کچھ ہوا اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ نقصان دونوں کا ہوا ہے۔ کم یا زیادہ اس کا حساب کرنے ہم یہاں نہیں آئے ہیں۔ دراصل ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ہمیں ایک طبقہ لگاتار بانٹنے کی

کوشش کر رہا ہے۔ ہم روز روز کمزور ہوتے جا رہے ہیں اور دنیا کے دوسرے ترقی پزیر ممالک ہمارے پچھڑے پن پر خوش ہوتے ہیں۔ اس لئے آپ سب سے پہلے آپس میں وشواس کرنا سیکھیں۔ اس کے بعد ہی شاید ہم ایسی طاقتوں سے لڑ سکیں گے۔

مہنت —— بہت سارے لوگوں نے ہمارے دھرم کو کار... ی طرح استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا لابھ راجنیتی کرنے والے لوگ اٹھا رہے ہیں۔ آپ کے اندر اگر بدلے کی بھاونا رہے گی تو آپ کے ساتھ دیس ٹوٹے گا۔ بلکہ ہم اور بھی کئی حصوں میں وبھاجت ہو جائیں گے۔ ہمیں اپنے اتیہاس کی رکچھا کرنی ہے۔ ہم آپس میں مل کر نہیں رہے تو دنیا کی بڑی طاقتیں ہمیں آسانی سے نگل جائیں گی۔ ہم پاکستان اور بنگلہ دیش کی طرح نہیں ہیں۔ ہم دنیا کی بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔

[تبھی ناظرین کے بیچ ہنگامہ ہونے لگتا ہے۔ مختلف گوشے سے کئی نوجوان اٹھ کر اسٹیج پر کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہوتے ہیں]

نوجوان ا —— بند کر دیجئے یہ ناٹک۔ بہلاوے کا یہ ناٹک بند کیجئے۔ کب تک ایسا چلے گا۔

لڑکی ا —— روک دیجئے۔ آگے پھر ایسا ہی ہوگا۔ دراصل آپ چھوٹے دائرے میں جینے کے عادی ہو چکے ہیں۔

نوجوان ۲ —— آپ نے آزادی کے بعد لگاتار ہمیں چھوٹا کیا ہے۔ آپ کس نقشے کی بات کر رہے ہیں؟ کون اتیہاس کو ٹھیک کرنا چاہتا ہے۔ مجھے معلوم ہے تاریخ کیا ہے۔

مہنت / مولانا —— آپ لوگ کون ہیں۔ آپ اسٹیج پر آیئے۔ ہم آپ کو ضرور سنیں گے۔

تینوں —— نہیں ہم کسی کو کچھ سنانے نہیں آئیں گے۔ ہم تصویر دکھانے آئیں گے۔

[اسٹیج پر اندھیرا۔ پھر دھیرے دھیرے اسکرین پر ایک مکمل ہندوستان کا نقشہ ابھرتا ہے۔ یہ وہی ہندوستان ہے جس میں پاکستان بھی ہے اور بنگلہ دیش بھی۔ اسکرین پر اس نقشے کے ابھرنے کے بعد تین دائرے بنتے ہیں۔ نوجوان ا پہلے دائرے میں، نوجوان ۲ دوسرے دائرے میں اور لڑکی ا تیسرے دائرے میں آکر باری باری ناظرین سے مخاطب ہوتے ہیں]

نوجوان ا —— میں ٹوٹے ہوئے ہندوستان سے بنایا گیا پاکستان ہوں۔ آزادی کے لئے لڑتے وقت کہیں نہیں تھا پاکستان۔ چند سیاسی لوگوں نے ہم کو بانٹ دیا۔ سچ ہے کہ اپنے ہندوستان سے ہم کو کاٹ دیا۔ آج بھی

ہماری آنکھوں سے بہہ رہے ہیں لہو۔ ہمیں چاہئے اپنا ہندوستان ہو بہو۔

لڑکی —— اور میں ہوں ٹوٹے ہوئے ہندوستان اور پھر ٹوٹے ہوئے پاکستان سے الگ ایک دیش یعنی بنگلہ دیش۔ اتیہاس کی کتابوں میں بھارت کا ہی حصہ ہے بنگلہ دیش۔ تو پھر کیسے ہوا یہ وناش۔ کیا اب نہیں ہو سکتا ایسی بھاوناؤں کا سروناش۔

نوجوان ۲ —— سچ ہے کہ یہاں ڈال ڈال پر سونے کی چڑیا بسیرا کرتی تھی۔ مگر اتیہاس کے مکمل بھارت کو اس طرح توڑے جانے کی کوششیں ہوئی ہیں کہ ایک روز ہمارا یہ درخت ہرے پتوں سے بھی خالی ہو جائے گا۔ میں ہندوستان ہوں۔ مگر نہیں چاہئے مجھے کٹا چھٹا ہوا ہندوستان۔ اگر اتیہاس کو سچ مچ ٹھیک کرنا چاہتے ہو تو ہمیں ہمارے نقشے جیسا ہندوستان چاہئے۔ ہمیں پورا ہندوستان چاہئے۔ تب ہی ہم قابو پا سکیں گے دنگوں پر، دیش وبھاجن پر، راجیوں کے بٹوارے پر۔ ہمیں ہمارے نقشے کا بھارت چاہئے، تبھی ہم بن سکتے ہیں مہاشکتی۔ تبھی ہم دنیا کے بڑے دیشوں کی سازشوں کا مل جل کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔

لڑکی —— ہم اگر گرا سکتے ہیں برلن کی دیوار، تو کیوں نہیں ڈھا سکتے ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش کے بیچ کھڑی کی گئی کمزور سی دیواروں کو۔

نوجوان ۱ —— آپ بتائیں...... ! کیا نہیں ڈھا سکتے ہم ان دیواروں کو۔ کیا نہیں حاصل کر سکتے پورا ہندوستان...... !

[ناظرین میں سے تالیاں بجاتے ہوئے چار پانچ افراد گاتے ہوئے اسٹیج پر آتے ہیں۔ تینوں ان کی آواز میں آواز ملاتے ہیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج پر بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ گانے کی آواز اور تیز ہوتی ہے]

کورس ——

بنگلہ دیش نہ پاکستان
لیں گے واپس ہندوستان
دیواریں اب توڑ بھی دو
یارو دل کو جوڑ بھی دو
دشمن کو جھنجھوڑ بھی دو
ان کی راہیں موڑ بھی دو

اب ایسی ہو اپنی تان
بنگلہ دیش نہ پاکستان
لیں گے واپس ہندوستان

ڈھادی برلن کی دیوار
پھر تم کو ہے کیوں انکار
نئے عہد کی یہی پکار
ہو پہلے سا ہم میں پیار

بیچ میں ہو نہ تیر کمان
بنگلہ دیش نہ پاکستان
لیں گے واپس ہندوستان

پیروں اور سنتوں کا بھارت
باپو کے سپنوں کا بھارت
پیار بھرے اپنوں کا بھارت
شاخوں پر گیتوں کا بھارت

لوٹے گی پھر اپنی شان
بنگلہ دیش نہ پاکستان
لیں گے واپس ہندوستان

نئی آواز نیا ہے رنگ
کوئی نہ ڈالے اس میں بھنگ

جن کاؔ مقصد کیول جنگ

ہم کردیں گے ان کو دنگ

پالے اب نہ کوئی گمان

بنگلہ دیش نہ پاکستان

لیں گے واپس ہندوستان

ہندوستان..........

ہندوستان..........

[روشنی تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ گیت گونجتا رہتا ہے اور دھیرے دھیرے پردہ گرتا ہے]

☆☆

شموئل احمد

مہاماری

(زیر تصنیف ناول کا ایک باب)

شروانی پھر روپوش ہو گئے......اب چندہ کون دیتا پھرے......؟ ملی جے پی کا کیمپ لگنے والا تھا اور مالے والے بھی جلوس نکال رہے تھے۔ عافیت اسی میں تھی کہ کہیں چھپ جاؤ......! لیکن ملّے کی دوڑ مسجد تک......شروانی پھر راجدھانی چلے آئے۔

راجدھانی میں کہاں تھوکو گے......؟ شروانی گاندھی میدان گئے اور شعلوں میں گھر گئے۔ وہاں ملی جے پی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ لاؤڈا سپیکر سے چنگاریاں نکل رہی تھیں:

"مسلمان کرائے دار کی طرح آئے اور مکان مالک بن بیٹھے۔ محمود غزنوی نے سومناتھ کا مندر لوٹا اور فرقہ پرستی کی بنیاد ڈالی۔ جن لوگوں نے پاکستان بنایا وہ اب ہمارے دیش میں اقلیت کا راگ الاپ رہے ہیں اور وشیش ادھیکار کی مانگ کر رہے ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کیا یہ مسلم تاناشاہی کا نیا روپ نہیں ہے......؟ دیش کے بٹوارے کے وقت ہندو اور مسلمانوں کو چھوٹ تھی کہ ہندوستان میں رہیں یا پاکستان میں۔ میں پوچھتی ہوں جو ہندو پاکستان میں رہ گئے کیا انہیں بھی حق ہے کہ مسجد توڑ کر مندر بنالیں......؟"

اور شروانی انگشت بہ دنداں تھے......! شعلے اگلتی ہوئی عورت کوئی اور نہیں ان کی منہ بولی بہن تھی مایا ساہنی......! شروانی وہاں سے فوراً کھسک گئے۔ دوسرے دن پتہ کیا مایا ساہنی کہاں رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ملی جے پی کی ایم ایل اے ہے اور چالیس نمبر ایم ایل اے فلیٹ میں رہتی ہے۔

دوسرے ہی دن وہ پھل اور مٹھائیاں لئے مایا ساہنی کے گھر پہنچے۔

مایا حیرت میں پڑ گئی......!

شروانی تم......؟؟"

شروانی مسکرائے

"یقین نہیں ہو رہا ہے......؟"

"یقین تو مجھے بھی نہیں ہوا جب تم بھاشن کر رہی تھیں......!

"تم وہاں تھے......؟

"وہیں تم کو دیکھا"

"ملنا چاہیے تھا"

"خوف محسوس ہوا"

"کیوں......"

"تم شعلے اگل رہی تھی

"لوگ مجھے فائر برانڈ کہتے ہیں!"

"تم نے اومادیوی کی زبان کہاں سے سیکھی"

"میں شروع سے بی جے پی میں ہوں"

"حیرت ہے......"

"تم یہاں کیسے......؟"

"واٹر ریسورسز میں ایکز یکوٹو انجینئر ہوں......!"

"بیوی بچے؟"

"تنہا ہوں......اور تم......؟"

"میری بھی نہیں...... خیر بتاؤ چاچا کیسے ہیں؟

"کافی بوڑھے ہو گئے ہیں......"

"تمہارا ایک بھائی تھا؟"

"وہ ہے......ڈھان چو......"

"اس کو تو سپنے آتے تھے؟"

"ابھی بھی آتے ہیں اور سچ ہو جاتے ہیں......"

"میں اپنے بارے میں پوچھوں گی......"

"کیا پوچھوگی......؟ یہی کہ مسلمانوں کا صفایا کب ہو گا......؟"

"اس طرح کیوں کہتے ہو......"

"یہ تم لوگوں کا پرانا سپنا ہے۔"

"تم ہند دماغ کے لوگ ہو...... تم لوگوں نے انسانی سماج کو دو حصوں میں تقسیم کیا...... مسلم اور کافر......اور کافروں کے خلاف جہاد کرنا فرض سمجھتے ہو......"

"تم لوگوں نے تو ہندو سماج کو ہی دو خانے میں بانٹ دیا...... فارورڈ اور بیک وارڈ......اور بیک وارڈ کو بھی کئی خانوں میں تقسیم کیا اور ان کے لئے تمہارے شاستر نے غیر انسانی قانون نافذ کئے......"

مایا چپ ہو گئی...... شروانی کو فضا میں تناؤ سا محسوس ہوا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر شروانی نے پوچھا

"تم اکیلی رہتی ہو......؟"

"ہاں!"

"تمہارے درباری نظر نہیں آرہے ہیں......؟"

سب ریلی کی تیاری میں جٹے ہیں...... آؤ اندر بیٹھتے ہیں"

وہ کمرے میں آئے۔ دیوار پر گرو گوالکر کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ شروانی مسکرائے

"گویا تم آر اس اس کیڈر کی ہو......!"

"ہم بیس سالوں کے بعد مل رہے ہیں......"

"پاپا کے ٹرانسفر کے بعد تو تم لوگوں سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"میں نے بی ایچ یو سے ایم اے کیا۔"

اسی لئے بی جے پی میں گئی......؟

کیوں......؟

"بی ایچ یو والے بی جے پی میں ہی جاتے ہیں"

"جس طرح علی گڑھ والے جماعت اسلامی میں جاتے ہیں"

شروانی ہنسنے لگے

''کچھ یاد ہے...... ؟ تم مجھے راکھی باندھتی تھی......''

''بھلا یہ بھی کوئی بھولنے کی بات ہے......''

''ایسا تو نہیں کہ وہ دھاگہ اڈوانی کے رتھ میں کہیں الجھ گیا...... ؟''

''میں نے تمہیں ہمیشہ بھائی سمجھا......''

''لیکن میری برادری سے نفرت کرتی ہو ؟''

''معاف کرنا...... ! تم لوگ دیش کے مکھ دھارے میں نہیں ہو......''

''یعنی...... ؟''

''تم لوگ ہجرت پر یقین رکھتے ہو ! تمہارے یہاں مادر وطن کا کوئی تصور نہیں۔ راشٹریتا کے وکاس کی پہلی شرط ہے جنم بھومی کو اپنی ماں سمجھنا اور پوری عقیدت رکھنا۔''

''یہ کہنے کی باتیں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندو کبھی متحد نہیں رہے اور باہر والوں نے حکومت کی۔ تمہیں مغل بادشاہوں سے شکایت ہے لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ مسلم شہنشاہوں نے ہندوستان کو اپنا مستقل مامن بنایا اور یہاں کی ریاستوں کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دور سلطنت میں اونچے عہدے پر ہمیشہ ہندو فائز رہے......''

''لیکن تم لوگوں نے مندر بھی لوٹا......''

''تمہیں محمود غزنوی تو یاد ہے لیکن وہ مغل شہنشاہ یاد نہیں ہیں جنہوں نے مندر بنوائے اور مسجد میں سنسکرت زبان میں اشلوک لکھوائے......''

مثلاً......

''عادل شاہ نے مسجد بنوائی جس کا شلالیکھ سنسکرت زبان میں ہے......''

مایا مسکرائی ''بہت جذباتی ہو۔ تمہارے لئے چائے بناؤں...... ؟''

''کیوں تکلف کرتی ہو...... ؟''

''اتنے دنوں بعد بھائی جو آیا ہے......''

''بھائی...... ؟ یا ہندو دماغ کا مسلمان...... ؟

مایا ہنسنے لگی۔ وہ کچن میں گئی تو شروانی نے ایک طائرانہ سی نظر چاروں طرف دوڑائی۔ ایک طرف شیلف پر پرانے اخبار تہہ کئے ہوئے تھے۔ میز پر پنچ جنیہ اخبار رکھا ہوا تھا۔ شروانی اخبار کی ورق گردانی کرنے

لگے۔مایا چائے لے کر آئی تو شروانی نے گرو گوالکر کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"تم ان کی آرتی بھی اتارتی ہو گی......"

"ایسا نہیں ہے......"

"مجھے حیرت ہے......"

"کیا......"

"تم نے بی جے پی کیوں جوائن کیا......؟"

"کیوں......؟"

"یہ اونچی ذات والوں کی پارٹی ہے......"

"تو کیا ہوا......؟"

"مایا ساہنی......تم براہمن نہیں شدر ہو......

"ایسی کیا بات ہے......؟"

"تم براہما کے پاؤں سے پیدا ہوئی......بازو، پیٹ یا منہ سے نہیں......"

مایا ہنسنے لگی۔

"تم ہنس رہی ہو لیکن یہی منوادی ویوستھا ہے۔بی جے پی جس ہندو سماج کی بات کرتی ہے اس میں شدر کی حیثیت فرد کی نہیں سیوک کی ہے جو نیچ ہے۔شدر کو مارنے کی منوسمرتی اتنی ہی سزا تجویز کرتی ہے جو کتے اور بلی کو مارنے کی ہو سکتی ہے۔

"کیا بکواس ہے......؟"

"منوسمرتی پڑھو!"

"یہ آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے"

"یہ آؤٹ آف ڈیٹ نہیں ہے۔یہ سناتن ہے۔یہ ہندو سماج کی بنیاد ہے۔اس نے ورن ویوستھا کو جنم دیا۔ورن ویوستھا ہندو مذہب کی آتما ہے۔دلت جب اپنے حق کی بات کرتے ہیں تو ورن ویوستھا خطرے میں پڑتی ہے۔اور اس طرح ہندو تو خطرے میں پڑتا ہے۔

مایا چپ رہی۔

"بی جے پی آئین بدلنے کی بات اس لئے کرتی ہے کہ آئین سیکولر ہے جس میں سبھی کے لئے برابر

حقوق ہیں۔ لیکن سنگھ خاندان کا سماجی نظریہ ان کے مذہبی نظریے کا پرتو ہے۔ ورن ویوستھا براہمن نے حصول مقصد کے لئے وضع کیا، فلاح انسانی کے لئے نہیں......"

"تم کیمونل ہو......"

"میں کیمونل نہیں ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم منوادیوں کے چکر میں کیسے پڑ گئی...... ؟"

"کیوں...... ؟"

منوادی اگر مسلمانوں کے لئے زہر اگلتے ہیں تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ ان کو ہر مسلمان میں محمود غزنوی نظر آتا ہے لیکن تمہاری جنگ مسلمانوں سے نہیں ہے۔ تمہاری جنگ تو منوادیوں سے ہے کہ انھوں نے شدر کو مذہبی اور سماجی حقائق سے محروم رکھا اور ان کے لئے غیر انسانی حقوق نافذ کئے......!

"کوئی اور بات کرو......"

"آخر کیا وجہ ہے کہ ابھی بھی تم لوگوں کو مندر میں جانے نہیں دیا جاتا...... ؟"

"کوئی اور بات کرو......"

یاد رکھو تم بی جے پی میں بہت دن نہیں رہ پاؤ گی......!

میں کہتی ہوں کوئی اور بات کرو...... ! مایا کا لہجہ تیکھا ہو گیا......!

"بی جے پی میں سبھی لیڈر اونچی ذات والے ہیں۔ پچھڑی ذات کا کوئی آدمی اس پارٹی میں اونچے عہدے پر نہیں پہنچ سکتا......

"سنا نہیں تم نے...... ؟ مایا ساہنی زور سے چیخی۔

شروانی نے اس کو غور سے دیکھا اور خاموش ہو گئے......ماحول میں اچانک جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ مایا کرسی کے ہتھے پر انگلیوں سے آڑی ترچھی سی لکیریں کھینچتی رہی۔ شروانی اٹھتے ہوئے بولے

"معاف کرنا مایا، تم بہن ہو اس لئے یہ سب کہنے کی جرات ہوئی ورنہ دوسروں کے سامنے...... !!"

"تم راجنیتی میں کیوں نہیں آتے...... ؟ مایا پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی

شروانی نے کوئی جواب نہیں دیا اور خدا حافظ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے......!

☆☆

رفعت سروش

بنام قوت صد نام

وہ ایک قوت صد نام جس کے قبضے میں
تمام ارض و سما ہیں تمام حرف وصدا
ہر ایک مخفی وظاہر حقیقت عالم
نظام گردش روح و بدن، فنا و بقا

وہ ایک قوت صد نام مالک عالم
اسی نے بندے کو تخلیق کا شعور دیا
اسی نے بخشی قلم کو یہ دولت نایاب
کہ جس نے لفظ کی عظمت کو آشکار کیا

فضامیں گونجتی آوازیں اس نے پیدا کیں
دہل دہل گئے سیارے، ٹکڑے ٹکڑے ہوئے
بدن زمینوں کے، ابھرے پہاڑ، دشت ودمن
سمندروں نے اچھالے وہ ابر کے پیالے

بہ قدر ذوق لکھی حمد اور ثنا میں نے
وجود باری کی وحدت کا اعتراف کیا
اٹھا جو عقل کا فتنہ کبھی تو پل بھر میں
عقیدتوں کے ہیولے پہ اس کو وار دیا

نہائے رحمت باری میں دشت اور کہسار
زمیں کے سینہ سوزاں سے کونپلیں پھوٹیں
روش روش پہ کھلے پھول زندگانی کے
ہوائے شوق سے سب خفتہ رونقیں جاگیں

مگر یہ کانٹا کھٹکتا ہے دل میں رہ رہ کر
یہ آب وگل کا جہاں پیاس کا نگر کیوں ہے
غریب شہر صداقت ازل سے ہے محتاج
تونگروں کی عنایت پہ منحصر کیوں ہے

☆☆

غیر حقیقی شہر کا حقیقی منظر نامہ

عجب شہر ہے یہ
یہاں کوئی مرتا نہیں ہے
فضاؤں میں لوبان کی خوشبوئیں بھی نہیں پھیلتی ہیں
نہ روضہ نہ درگاہ کوئی
نہ شمشان گھاٹوں میں مردہ بدن کو جلانے کی کوئی روایت

ہزاروں ہی بیوائیں اس شہر میں ہیں
مگر ان کے شوہر ابھی تک ہیں زندہ
نہ ملعون ہیں وہ نہ معتوب ہیں وہ
ہمیشہ یہ مرغوں کی بانگوں پہ لبیک کہتی رہی ہیں
کہ شطرنج کی ایسی بازی لگی ہے
نہ فاتح نہ مفتوح کا فیصلہ ہو سکے گا
نہ ہاتھی کے قدموں کی چاپیں کہیں ہیں
نہ گھوڑوں کی ٹاپیں
پیادے ہیں مصروف بازی

کئی ہیں یہاں سرخ گل کے پجاری
کسی کی جبیں پر ہیں تیرہ ستارے
نہ آئے نظر میں کہیں سبز پارے
خلاؤں کی نیلاہٹوں پر

ہے کوؤں کا قبضہ

کہیں فاختائیں بھی سوئی ہوئی ہیں

نہ صہبا نہ ساغر

نہ جمشید باقی

نہ مشتاق دل ہے

نہ دریا کے تٹ پر کوئی جان ہارے

نہ عاشق نہ صادق کا راسخ عقیدہ

نہ راجا نہ رانی

نہ مظلوم و ظالم

یہاں صوفیوں، نیک کاروں، بزرگوں

رشی سادھوؤں کی قطاریں لگی ہیں

ہے انداز ان کا بہت ہی نرالا

ہر اک سانس سے پارسائی کا احساس ہونے لگے گا

کہ جیسے

کسی پیر زادے نے دانشوروں کی جماعت کو مخلوق کر کے

محبت سے ہاتھوں پہ بوسہ دیا ہے

شکایت، حکایت

عبادت، زیارت

یہ الفاظ صندوقچے میں پڑے رو رہے ہیں

(ہیں صندوقچے یا تخیل پرستوں کی آماجگاہیں)

انہیں سونے چاندی کے سکوں کے مانند رکھا گیا ہے

کبھی تو نوادر عجائب بنیں گے

کبھی میوزیم کی یہ رونق بنیں گے

کبھی بے بہا دام ان کے ملیں گے

نہ گرمی کا منظر

نہ لشکر نہ بختر

نہ کوفہ نہ اصغر

نہ ماتم کناں دل

خطاکار کوئی نہیں ہے

گنہ گار کوئی نہیں ہے

سردار کوئی نہیں ہے

ہر اک شئے فنا سے پرے جا پڑی ہے

یہاں کا ہر اک آدمی بھشم کے منتروں سے ہے واقف

یہاں کے ہر اک فرد کے حافظے میں

گنہ کا وہ پہلا تصور

گناہوں کی حکمت

بصیرت، مسرت

کوئی شئے بھی باقی نہیں ہے

مگر میری خواہش ہے مرنے کی لوگو!

گنہ میرے اندر کا مجھ کو

اذیت سے دوچار کرتا رہا ہے

دل و جاں آتش کدہ بن گئے ہیں

مری یہ دعا ہے

کہ میں موت کا ذائقہ چکھ کے دیکھوں!

☆☆

انجم فاطمی

تیرے نام......

دیکھ کر تجھ کو مری آنکھ سے بہتا ہے لہو
اۓ مرے والد ناشاد کی ناشاد بہو

تیری آنکھوں کی نمی اور یہ چہرے کی تھکن
دیکھ کر جس کو بڑھی جاتی ہے دل کی دھڑکن

تیرا رشتہ رہا ہر حسرت ناکام کے ساتھ
روز پستی رہی تو گردش ایام کے ساتھ

موسم گل بھی طبیعت تری بہلا نہ سکا
قلب مضطر کو ترے چین کبھی آ نہ سکا

ایک لمحہ بھی مرے گھر میں نہ آرام ملا
کچھ ملا بھی تو تجھے بادہ آلام ملا

کوئی موسم ہو کبھی راس نہ آیا تیرے
اور بجز غم کے کوئی پاس نہ آیا تیرے

اپنی ہر ایک تمنا کو لہو کرتی رہی
دل کی دنیا میں مری پھر بھی خوشی بھرتی رہی

تو کہ ہر روز بناتی رہی خوابوں کے محل
تو کہ ہر روز سجاتی رہی خوابوں کے محل

پھر مری دنیا میں اک روز وہ آندھی آئی
چھن گئی تاب نظر، آنکھ مری پتھرائی

ایک لمحے میں وہ خوابوں کا محل ٹوٹ گیا
میرے ہاتھوں سے وہ دامان طرب چھوٹ گیا

راہ مسموم تھی ہر سمت اندھیرا تھا بہت
اس اندھیرے میں کہاں جاؤں کہ خدشہ تھا بہت

دور تجھ سے وہ تری شوخی گفتار ہوئی
اور پابند سلاسل تری رفتار ہوئی

منتظر وقت تھا خود جس کے اشارے کے لئے
آج محتاج ہے وہ میرے سہارے کے لئے

نطق نے تیرے نئی نسل کو گویائی دی
آنکھ جو بند تھی اس آنکھ کو بینائی دی

وقت نے چھین لی وہ قوت پرواز تری
ڈوب کر رہ گئی سناٹے میں آواز تری

بھول سکتا نہیں وہ ساتھ گزارے لمحے
دھند میں ڈوب گئے سارے کے سارے لمحے

☆☆

شمیم فاروقی

واہی صاحب کے منظوم خط کے جواب میں

اٹھایا زمانے نے الٹا قدم
شرافت کی حد ہوگئی محترم

جسے تھا عزیزوں میں کرنا شمار
اسے آپ کہتے ہیں "عالی حشم"

ادھر دیکھئے میری نالائقی
ادھر یہ عنایت یہ لطف وکرم

غنیمت قسم آپ کی ذات ہے
سلامت خدا آپ کا رکھے دم

تقاضائے اہل ستم تھا یہی
"کہ لطف نظر ہم پہ ہو کم سے کم"

غضب مشہدی نے بھی یہ کہہ دیا
"زبردستی طاری کئے خود پہ غم"

یوں ہی بے سبب کوئی روتا ہے کیا
ذرا پوچھئے وہ ہیں اہل قلم

اگر پھر ملیں تو یہ کہہ دیجئے
غم زندگی کو نہ سمجھیں قلم

کبھی یوں بھی ہوتا ہے عالی جناب
"اٹھائے سے اٹھتا نہیں ہے قدم"

اب ایسے میں کیا "ماسوا" کا خیال
سمجھتا نہیں کوئی روداد غم

کہاں قدر ہوتی ہے فن کار کی
ہیں یکساں شکار اس کے وہ، آپ، ہم

کہیں گھر کے باہر نکلتے نہیں
نظر کس طرح آئے بازار غم

"روایت سے جدت کا یہ فاصلہ"
ہے بس گردنی باغ سے دوقدم

اجازت کہ فرصت ملی تو شمیم
کرے گا کبھی حالت دل رقم

☆☆

راشد انور راشد

محبت کے مختلف رنگ

پھول ہی پھول تھے راہوں میں ابھی کل کی ہے بات
گھر کے ہر گوشے میں جنت کا گماں ہوتا تھا
اب کے موسم میں مگر بدلی فضا نے رنگت
آنکھ جھپکی تو نگاہوں میں عجب منظر تھا
دھول ہی دھول تھی راہوں میں تمنا کی جگہ
پہلے وہ رت تھی کہ آنکھوں میں کنول کھلتے تھے
اب یہ عالم ہے کہ کھلتے ہیں اداسی کے ببول
گھر وہی ہے، درودیوار وہی ہیں لیکن
اجنبیت ہے کہ ہر گام نکھی جاتی ہے
اک سمندر مرے پہلو میں رواں رہتا ہے
پھر بھی اک عمر سے پیاسا ہی رہا ہوں میں تو
کیا پتہ کیسی تڑپ ہے کہ جو مٹتی ہی نہیں
موسم دل تو بدلتا ہی نہیں ہے لیکن
بھولے بھٹکے کسی بدلی کا گزر ہوتا ہے
آج خوش رنگ خیالوں کی گھٹا چھائی تھی

شاید اب بیت چکا ہوگا خزاں کا موسم
آئی ہوگی مرے ویرانے میں چپکے سے بہار
لیکن اس بار بھی کھل پائے نہ امید کے پھول
ریزہ ریزہ مری خواہش کو بکھرنا ہی پڑا
آج جب خوشیوں کو پانے کے لئے گھر آیا
دل پہ اک چوٹ لگی خود کو اکیلا پاکر
سب مرے چاہنے والے تھے مرا کوئی نہ تھا
آج بس ڈوبتی سانسیں ہیں مرے غم میں شریک
دل برباد کو اشکوں کا سہارا نہ ملا
درودیوار کبھی گھر کا بدل ہوتے نہیں
بھیڑ میں رہ کے بھی انسان جہاں تنہا ہو
ایسی محفل سے تو ویرانہ بھلا ہوتا ہے
آج ہر لمحہ کہ جب ٹوٹ رہا ہوں میں بھی
دل کے ویران کھنڈر سے یہ صدا آتی ہے
کیوں سکوں پانے چلا آیا ہوں گھر کی جانب
میں وہیں ٹھیک تھا پردیس جسے کہتے ہیں

(۶)

میں تجھے اپنی محبت کا یقیں کیسے دلاؤں
میرے اشکوں پہ تجھے اب تو بھروسہ بھی نہیں
میری آہوں کی صدا سننا گوارا نہ کیا
حال کیا ہوگا مرا تو نے یہ سوچا بھی نہیں
مجھ کو احساس ہے کشتی نہ کنارے سے لگی
اور طوفان نے موجوں سے نبھائی سازش
پھر بھی میں وقت کو الزام نہیں دے سکتا
جرم جب میں نے کیا ہے تو سزا مجھ کو ملے
میں ترے قرض محبت کو ادا کر نہ سکا

اس لئے تجھ سے نہیں خود سے بھی شرمندہ ہوں
یہ مگر یاد رہے مجھ کو بھلانے والے
میں ترے جسم نہیں روح کا باشندہ ہوں
اس لئے جان مری آج تلک زندہ ہوں

(۳)

جب بھی نفرت سے یہ دنیا مجھے ٹھکراتی ہے
چپکے چپکے ہی میں تنہائی میں رو لیتا ہوں
ہوگی دنیا کے لئے ایک سزا تنہائی
پر مرے واسطے انمول سی اک نعمت ہے
اس نے ہر بار بچایا ہے مجھے ٹوٹنے سے
اس نے ہر بار مری آنکھ سے آنسو پونچھے
اس نے ہر بار مرا درد جگر بانٹا ہے
لیکن اس بار مرا درد تھمے گا کیوں کر
چھوٹتا جاتا ہے تنہائی کا دامن مجھ سے
جب نگاہوں نے مری خواب بسائے تیرے
نیند آنکھوں سے گئی چین کلیجے سے گیا
ٹوٹ کے پھر سے بکھر جاؤں نہ محفل میں کہیں
چاہتا ہوں کہ میں تنہائی میں یکجا ہو جاؤں
پر کروں کیا کہ یہ ارمان بھی دم توڑ گیا
نیند پلکوں کو کسی پل نہیں سونے دیتی
یاد تیری مجھے تنہا نہیں ہونے دیتی

☆☆

سلیمؔ انصاری

تلاش

کئی دنوں سے نئی نظم کی تلاش میں ہوں
میں اپنی فکر کے دریاؤں کو کھنگال چکا
وہاں بھی کچھ نہیں ایسا
جو نظم بن جائے
بس اک خلا ہے
جسے جی رہا ہوں میں چپ چاپ
کسی خوشی کی طلب ہے نہ غم کا اندیشہ
عجیب بے طرح یکسانیت کا موسم ہے
کئی دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا
کسی نے دل بھی دکھایا نہیں کئی دن سے
دراڑ بھی نہیں کوئی لہو کے رشتوں میں
کئی دنوں سے کوئی زخم بھی نہیں مہکا
کوئی بھی شئے نہیں معمول کے خلاف مگر

مرے خدا ——
مجھے توفیق نظم دے، جو مجھے
بچا کے رکھتی ہے
اندر کی بے لباسی سے
مرا وجود سجاتی ہے
خود شناسی سے

☆☆

مخمور سعیدی

غزل

کچھ پہلوؤں کو میری نظر دیکھتی نہ تھی
دنیا بری تو تھی مگر اتنی بری نہ تھی

اٹھ کر تری گلی سے عجب تجربہ ہوا
انجان ہم سے شہر کی کوئی گلی نہ تھی

ان راستوں پہ راہنما تھیں کچھ آہٹیں
وہ راستے کہ جن میں کہیں روشنی نہ تھی

طائر نے کیوں اسی پہ نشیمن بنالیا؟
جو شاخ نامراد شجر کی ہری نہ تھی

دن آج اس کے ساتھ گزارا، غضب کیا
اتنی تو میری رات اکیلی کبھی نہ تھی

ترک وطلب کے موڑ پہ ٹھہرے ہوئے تھے ہم
ہونٹوں پہ دل کی بات ابھی تھی، ابھی نہ تھی

اپنے لبوں پہ جس کو سجائے ہوئے تھا میں
تم تو گواہ ہو کہ وہ میری ہنسی نہ تھی

کیوں ہو گئی اداس طبیعت ہجوم میں
دل میں ترا خیال، تری یاد بھی نہ تھی

تجھ سے نظر ہٹی تو نہ اٹھی کسی طرف
پھر منظر حیات میں کچھ دلکشی نہ تھی

تنہائیوں کا ساتھ نبھاتے کس آس پر
تجھ سے کبھی ملیں گے یہ امید ہی نہ تھی

مخمور اس نے توڑ دی کس تمکنت کے ساتھ
رشتے کی ایک ڈور کہ جو ٹوٹتی نہ تھی

☆☆

مظفر حنفی

غزلیں

اک آبشار تھا مجھ کو بہانے والا تھا
میں گردباد اسے سر چڑھانے والا تھا
جنہوں نے آگ لگائی وہ مہرباں تھے مرے
میں اس خرابے کو خود ہی جلانے والا تھا
خبر ہے آج وہاں زندہ گڑ گیا کوئی
دکان اپنی جہاں میں لگانے والا تھا
اسی کو باندھ کے پھینک آئے لوگ دریا میں
وہی تو شہر میں کشتی بنانے والا تھا
ترے دیار کی رونق سے کیا بہلتا جی
وہاں تو جو بھی ملا دل دکھانے والا تھا
پھر اس کو یاد کیا اور میں نے موندلی آنکھ
کہ اس کے بعد نظر کون آنے والا تھا
مجھے بکھرنے نہیں آیا پھول کی مانند
بس ایک کانٹا تھا اور ٹوٹ جانے والا تھا

☆☆

لائق دید وہ نظارا تھا
لاکھ نیزے تھے سر ہمارا تھا
بادباں سے الجھ گیا لنگر
اور دو ہاتھ پر کنارا تھا
اب نمک تک نہیں ہے زخموں پر
دوستوں سے بڑا سہارا تھا
شکریہ ریشمی دلاسے کا
تیر تو آپ نے بھی مارا تھا
آسماں بوجھ ہی کچھ ایسا ہے
سر جھکانا کسے گوارا تھا
دوستو! بات دسترس کی تھی
ایک جگنو تھا ایک ستارا تھا
ایک آندھی سی بال و پر میں ہے
غالباً آپ نے پکارا تھا

☆☆

سلطان اختر

غزلیں

برا ہوا ہے یقیناً بہت برا ہوا ہے
ہمارے حق میں اگر کوئی فیصلہ ہوا ہے

ہر آئینے میں گل رنگ و بو کھلا ہوا ہے
نگار خانہ ترے عکس سے سجا ہوا ہے

کسی کے قرب کی خوشبو کسی کی یاد کا چاند
کہ طاق دل پہ بہت کچھ ابھی رکھا ہوا ہے

نہ میں ہی دامن حرص و ہوس سمیٹ سکا
نہ ختم اس کی عنایت کا سلسلہ ہوا ہے

اسی کی خاک طلب سب اڑا رہے ہیں یہاں
ہر ایک شخص مری طرح سر پھرا ہوا ہے

کسی کے لب پہ مگر بے مثال پیاس نہ تھی
گھروں میں یوں تو بہت شور کربلا ہوا ہے

ہتھیلیوں کی لکیروں میں کیا رکھا ہے میاں
اسے پڑھو ورق دل پہ جو لکھا ہوا ہے

نہ ہنس رہا ہے کوئی اب نہ رو رہا ہے یہاں
یہ کن بلاؤں میں ہر آدمی گھرا ہوا ہے

کبھی تو مجھ پہ کھلے گا وہ تہہ بہ تہہ اختر
جو سات پردوں کے اندر ابھی چھپا ہوا ہے

نہ سفیدی نہ سیاہی اپنی
سامنے اب ہے تباہی اپنی

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں
اب نہ ہم ہیں نہ انا ہی اپنی

پہلے شاہی میں فقیری گم تھی
اب فقیری میں ہے شاہی اپنی

آج بھی کوچہ جاناں کا طواف
راہ بھولے نہیں راہی اپنی

وقت کی بھیڑ میں گمراہ ہوئے
ہم کہیں ہیں نہ صدا ہی اپنی

سر جھکانے سے بھی جھکتا نہیں اب
خیر ہو ظل الٰہی اپنی

ڈھونڈتی پھرتی ہے اب قوس و قزح
کیا ہوئی سادہ نگاہی اپنی

اس نے تزئین بدن کی خاطر
چاک کر ڈالی قبا ہی اپنی

اب بھی روشن ہے سروں پر اختر
طرز شائستہ کلاہی اپنی

☆☆

صدیق مجیبی

غزلیں

(منیژہ کے لئے)

خفا بھی رہتا ہے مجھ سے اکثر خیال رکھنا بھی جانتا ہے
مجھے بکھرنے نہیں دیا وہ سنبھال رکھنا بھی جانتا ہے
تمام تر لغزشوں کا میری حساب رکھتا ہے وہ نظر میں
نہال کرنا بھی اسکی چاہت ملال رکھنا بھی جانتا ہے
جو نرم لہجے کی رمزیت سے لہو کو بھی شب چراغ کر دے
وہ میری سانسوں میں اپنی بوئے وصال رکھنا بھی جانتا ہے
مجھے وہ کب لاجواب کر دے وہ چاہے جب بے پناہ کر دے
وہ اپنی پلکوں میں ایسے چبھتے سوال رکھنا بھی جانتا ہے
بدن کہ کچنار پیڑ کوئی، ملیح بادل سے ڈھک گیا ہو
وہ میرا محبوب سانولا سا، جمال رکھنا بھی جانتا ہے
سکوت شب بھی تو ایک نغمہ یگوں یگوں سے سنا رہا ہے
ہے دشت دل بھی اجاڑ لیکن غزال رکھنا بھی جانتا ہے

زمیں کج رو ہے اپنی اور الزام آسماں پر ہے
کہانی میں تحیر حرف ناگفتہ بیاں پر ہے
ابھی فرصت کہاں باد مخالف سے الجھنے کی
ابھی تو دھیان آندھی میں خس و خاشاک جاں پر ہے
نجانے کب کے پیاسے ہیں یہ منہ کھولے ہوئے پنچھی
کوئی بادل بتاتا بھی نہیں پانی کہاں پر ہے
ہوا سازش میں ہو تو ہر بگولے کو بھنور کر دے
نظر اپنی سمندر سے زیادہ بادباں پر ہے
خدا جانے گھڑی کب آئے ہجرت سے پلٹنے کی
ابھی تو سب اثاثہ زندگی کا کارواں پر ہے
مجیبی ایک اک چہرہ مری یادوں میں روشن ہے
شمار زخم دل اپنا حساب دوستاں پر ہے

☆☆

صدیق مجیبی

غزلیں

کہیں کوئی تو ہے دل پر مسلسل وار کرتا ہے
دریچے کھولتا ہے پھر اسے دیوار کرتا ہے

میں اک تنکا ہوں اسکے سیل لذت کوش کے آگے
میں اسکا جسم بن جاتا ہوں جب سرشار کرتا ہے

میں مرجاتا، ستم یہ ہے کہ دل مرنے نہیں دیتا
مجھے آسانیاں ملتی ہیں یہ دشوار کرتا ہے

بہت عاجز ہوں میں پتوار دل کے ہاتھ میں دے کر
سفینہ غرق کرتا ہے نہ دریا پار کرتا ہے

چلو جی لیں کہ بے معنی ہوئی جاتی ہے یہ دنیا
ابھی تک تو نشہ زخموں کو نغمہ بار کرتا ہے

وہ زندہ ہیں تو اپنی کج کلاہی بھی سلامت ہے
مجیبی بے سبب کیوں دشمنوں سے پیار کرتا ہے

شام کجلانے لگی ہے میکدہ روشن کریں
شب کے استقبال میں کوئی دیا روشن کریں

خم سے سمجھوتہ بھی ہو جائے گا تھوڑی دیر میں
جشن یاد رفتگاں کی ابتدا روشن کریں

رات کی زلفوں میں عکس مئے سے تارے جھلملائیں
روشنی ساغر میں کم ہو دوسرا روشن کریں

دل کے زخموں کو چمن کی خوشبوئیں سرشار ہوں
جام ہونٹوں سے لگائیں اور دعا روشن کریں

ہم جلائیں اپنے دل کو تم جلاؤ سب کے گھر
تنہا ممکن بھی نہیں ساری فضا روشن کریں

ایک کنکر سے اٹھی لہریں سمندر کو محیط
ہم بھی اک حرف غزل سے دائرہ روشن کریں

☆☆

ظفر گورکھپوری

غزل

دنیا سکڑ کے عرصہ گہ گل ہی رہ نہ جائے
ایسا نہ ہو کہ جینے کے قابل ہی رہ نہ جائے

اس کا اتا پتہ توہو جاتاہے جس کی سمت
ہمراہ اپنے دوری منزل ہی رہ نہ جائے

کچھ ڈوبنے ابھرنے کے بھی کھیل ساتھ ہوں
منصوبے میں رسائی ساحل ہی رہ نہ جائے

ائے حد ضبط ٹوٹ، کہیں بن کے زندگی
سینے پہ صبر جیسی کوئی سل ہی رہ نہ جائے

کم ہورہاہے ہر نئی منزل پہ ایک دوست
پھر آج اپنے ساتھ کہیں دل ہی رہ نہ جائے

ورثے میں اپنے بچوں کو دینے کے واسطے
ڈرہے خیال وخواب کی محفل ہی رہ نہ جائے

نظروں کے انتشار مین تعمیر کی نہ پوچھ
ممکن ہے کوئی نقشہ مقابل ہی رہ نہ جائے

☆☆

کرشن کمار طور

غزل

خوداپنی ذات کا شاید سراغ رکھ دیاہے
ہواکے سامنے ہم نے چراغ رکھ دیاہے

ہمیں نے خودکو کیاہے انا حصول بہت
کہیں پہ دل تو کہیں پہ دماغ رکھ دیاہے

ہوس دریچہ کرے واجہاں سے جی چاہے
بدن کے سامنے پھولوں کا باغ رکھ دیاہے

ہے میرے ہونے میں مخفی مرانہ ہونا بھی
بھلا یہ خاک نے کیسا سراغ رکھ دیاہے

ہوں شعر خندہ میں اس دور غم خزانی میں
یہ تیری آنکھ نے کیساایاغ رکھ دیاہے

ہمیں نے وسعت صحراکو بے کنار کیا
ہمیں نے نوک سناں اک چراغ رکھ دیاہے

کچھ اختیار نہیں ہم کو اپنے آپ پہ طور
تھے لفظ رکھنے جہاں دل کا داغ رکھ دیاہے

☆☆

سید امین اشرف

غزل

گلستان و گیاہ سبزہ پیہم یاد کرتے ہیں
مری زنجیر، اس کا عالم رم یاد کرتے ہیں

گماں ہوتا ہے یہ افسردہ ونم دیدہ راتوں سے
ستارے بھی برنگ رقص شبنم یاد کرتے ہیں

بھٹکنے سے انہیں مشکل پسندی راس آئی ہے
تجھے بھی رہروانِ راہ پر خم یاد کرتے ہیں

سکون آغوش میں ہے اور میں کس مخمصے میں ہوں
خم دیوار و خار دشت باہم یاد کرتے ہیں

جو آنکھیں ہوں تو رنج رائیگاں تیرے سوا بھی ہے
گزر جاتے ہیں جو لمحے انہیں ہم یاد کرتے ہیں

چمن پر شاق تھا خوشبو کا پھولوں سے جدا ہونا
نئے برگ و ثمر وہ روز ماتم یاد کرتے ہیں

ہوئی اک خوشہ گندم سے دنیا خلد نظارا
قلق سے کیوں شکست عہد محکم یاد کرتے ہیں

بتان عہد حاضر سے گلہ ہے کاہش دل کو
کہ یہ سلطانی دینار و درہم یاد کرتے ہیں

کسی صوفہ نشیں نے چھو دیا تھا بے خیالی میں
اسے یہ کاغذ و گلدان والبم یاد کرتے ہیں

☆☆

عطا عابدی

غزل

زوال ذات کو بھی وہ کمال کہتی ہے
ہنوز رائے یہ خوش فہمی انا کی ہے

مری وفات سے چہرہ ہے جس کا نور افشاں
وہ زندگی مجھے نادان ہی سمجھتی ہے

سوار سر پہ بغاوت ہے زخم گل کی طرح
حماقت آنکھ میں خاروں کی طرح چبھتی ہے

طلوع ہوتے ہی سورج کو جیب میں رکھ کر
مجھی سے پوچھتے ہیں لوگ صبح کیسی ہے

عزیمتوں پہ ہوئیں جب سے رخصتیں غالب
عبادت اپنی جزاؤں کی راہ تکتی ہے

اسی کو دیکھ رہا ہوں کہ آئینہ ہے وہ
وہ ایک چہرہ کہ جس کو نظر ترستی ہے

مرے چراغ سے نادم ہے آج بھی سورج
کہ اس کی دھوپ دریچے سے آکے ملتی ہے

کسی سے ذکر جہنم کا کردیا ہوگا
مری انا مجھے آتش پرست کہتی ہے

نگاہ وقت سے اوجھل عطا نہیں ہوگا
کتاب ذات میں وہ کائنات رکھ دی ہے

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

دھان کے کھیتوں پہ آئیں بدلیاں اڑتی ہوئی
جب جلا کر جاچکیں چنگاریاں اڑتی ہوئی

بات کچھ تو ہے یقیناً کاغذی پھولوں میں بھی
بے تحاشہ آرہی ہیں تتلیاں اڑتی ہوئی

عشق کیا ہے خوبصورت سی کوئی افواہ بس
وہ بھی میرے اور تمہارے درمیاں اڑتی ہوئی

تیز بارش میں پرانی یاد کے پٹ کھل گئے
کل جو دیکھی نیلی پیلی چھتریاں اڑتی ہوئی

مجھ کو بھی پہلے پہل اچھے لگے تھے یہ گلاب
ٹہنیاں جھکتی ہوئیں اور تتلیاں اڑتی ہوئی

کھولتی ہیں دھیرے دھیرے جھوٹی سرشدی کا بھید
جھومتے پیڑوں سے سوکھی پتیاں اڑتی ہوئی

کیا نشانی دے گئے ہیں جانے والے بھی ہمیں
راکھ کا اک ڈھیر اور چنگاریاں اڑتی ہوئی

ہاتھ ہریالی کا اک پل میں جھٹک سکتا ہوں میں
آگ بنکر سارے جنگل میں بھڑک سکتا ہوں میں

میں اگر تجھ کو ملا سکتا ہوں مہروماہ سے
اپنے لکھے پر سیاہی بھی چھڑک سکتا ہوں میں

اک زمانے بعد آیا ہاتھ اس کا ہاتھ میں
دیکھنا یہ ہے مجھے کتنا بہک سکتا ہوں میں

آئینے کا سامنا اچھا نہیں ہے بار بار
ایکدن اپنی ہی نظروں میں کھٹک سکتا ہوں میں

کشتیاں اپنی جلا کر کیوں تم آئے میرے ساتھ
کہہ رہا تھا مات کھا سکتا ہوں تھک سکتا ہوں میں

ہے سر تسلیم خم تیری حکومت کے حضور
ایک حد تک ہی مگر پیچھے سرک سکتا ہوں میں

اب اسے غرقاب کرنے کا ہنر بھی سیکھ لوں
اس شکارے کو اگر پھولوں سے ڈھک سکتا ہوں میں

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

مسکرائیں ٹہنیاں اور رنگ وبو نے بات کی
ایک سوکھے پیڑ سے کل آبجو نے بات کی

حال دنیا پوچھ کر میں مخمصے میں پڑ گیا
سارے منظر چپ رہے تازہ لہو نے بات کی

دل سے دہشت گرد نے بھی پیار سے یکھا اسے
مسکرا کر پہلی بار اک جنگ جو نے بات کی

بج رہے ہیں میرے کانوں میں ستار اور جلترنگ
تو نے مجھ سے کچھ کہا کیا مجھ سے تو نے بات کی

اس کے باطن کا بھی دنیا کو پتہ چل جائے گا
آگ پھیلے گی اگر اس صلح خو نے بات کی

کچھ عجب سے واقعے ہوتے رہے ہیں میرے ساتھ
لفظ نے لکھا مجھے اور گفتگو نے بات کی

اب مجھے کچھ اور بھی محتاط رہنا چاہئے
کانپتے لہجے میں کل مجھ سے عدو نے بات کی

چلا رہے تھے لوگ ہی آب آب بے سبب
بستی میں آخر آگیا سیلاب بے سبب

ایسا نہیں کہ جی نہ سکیں گے ترے بغیر
دیکھے گئے یوں ہی کئی خواب بے سبب

پتھر نہیں تو پھول ہی پھینکا ہے آپ نے
یوں جاگتا نہیں کوئی تالاب بے سبب

ہم لوگ تیرے غم سے سبکدوش ہوگئے
کرتے نہیں ہیں آنکھ کو خوں ناب بے سبب

لہروں کا سر کچلنا بھی ہوتا ہے مدعا
بنتے نہیں ہیں بحر میں گرداب بے سبب

سورج کو جا کے اور کہیں اگنا چاہئے
اندھوں میں کھو رہا ہے تب و تاب بے سبب

دریا ہی صرف ایک ہی کشتی سے بیر تھا
ہم لوگ آگئے ہیں تہہ آب بے سبب

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

یہاں اب، شور ہی کوئی نہ سرگوشی کسی کی
اگر کچھ ہے تو شاید ہو یہ خاموشی کسی کی

بلاناغہ اسے خوں آدمی کا چاہئے اب
ہمیں کھلنے لگی ہے یہ بلانوشی کسی کی

اچانک چلتے چلتے اونگھنے لگتا ہے سورج
شفق زاروں پہ چھا جاتی ہے مدہوشی کسی کی

یہاں گرتے ہیں ہر دم ٹوٹ کر شاخوں سے پتے
فضا میں گونجتی رہتی ہے سرگوشی کسی کی

وہ قبرستان کا نقشہ ہی رکھ دیں گے بدل کر
کسی کی تاج پوشی ہے تو گل پوشی کسی کی

گلی میں پھر وہی پرچھائیاں لہرا رہی ہیں
مری آہٹ سے کب ٹوٹی ہے بے ہوشی کسی کی

وحشتوں کے پر کتر سکتا ہوں میں
آسمانوں سے گزر سکتا ہوں میں

مہرباں !اب دوسرا کوئی ہدف
اور کتنی بار مر سکتا ہوں میں

کون سمجھائے مرے مداح کو
تالیوں سے بھی بکھر سکتا ہوں میں

اس نے خود مختار مجھ کو کردیا
جی نہیں سکتا تو مر سکتا ہوں میں

کوئی کشتی میری کمزوری نہیں
بیچ دریا رقص کر سکتا ہوں میں

ماورائے لمس ہے اس کا بدن
بس اسے محسوس کر سکتا ہوں میں

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

ایک پل میں ٹوٹنے کو ہے سمندر کا سکوت
یہ اشارہ کررہا ہے ریت کے گھر کا سکوت

ہم بہت پچھتائے آوازوں سے رشتہ جوڑ کر
شور اک لمحے کا تھا اور زندگی بھر کا سکوت

ہوسکے تو کیجئے اب زلزلے کا اہتمام
ورنہ دستک سے نہیں ٹوٹے گا اس گھر کا سکوت

ایک شام ایسی بھی آئے ہم انہیں کے ہورہیں
یہ اداسی کے جزیرے یہ سمندر کا سکوت

کوئی تو آواز ابھرے دل کے ویرانے سے اب
چاٹتا جاتا ہے مجھ کو میرے اندر کا سکوت

ایک لمحے میں شفق کے رنگ کو کجلا گئی
اس کی پل بھر کی اداسی اس کا پل بھر کا سکوت

گھپ اندھیرا ہے یہاں کون سا در کھلتا ہے
چاند جس سمت ہو دروازہ ادھر کھلتا ہے

اور کچھ بھی نہیں اس لمبے سفر کا حاصل
اک دریچہ جو سر راہ گزر کھلتا ہے

عین ممکن ہے کہ اس گھر میں مرا دم گھٹ جائے
کوئی دیوار ہی گرتی ہے نہ در کھلتا ہے

اپنی چہکار میں رونے کی صدا کس نے سنی
کب پرندوں پہ کوئی راز شجر کھلتا ہے

مجھ پہ کس درجہ ہیں سورج کی عنایات نہ پوچھ
میری دہلیز پہ ہی دھوپ کا سر کھلتا ہے

میرے محسن سے کہو اپنی ردا لے جائے
پاؤں ڈھکنے بھی نہیں پائے کہ سر کھلتا ہے

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

معاملہ یہ خودی کا نہ بے خودی کا ہے
تمام پھیلا ہوا سلسلہ نفی کا ہے
یہ جان لو تو ڈرو گے مجھے چراغ سے بھی
وہ رابطہ جو مرے ساتھ روشنی کا ہے
نفس کی آمد و شد سے کچھ اطمینان نہیں
مرا ارادہ کسی اور زندگی کا ہے
سمجھ رہا تھا کہ گمراہ کر رہی ہے ہوس
یہ راستہ تو مگر آپ کی گلی کا ہے
وہ سانپ جس نے مجھے آج تک ڈسا ہی نہیں
تمام زہر سخن میں مرے اسی کا ہے

تمام بے سر و سامان اڑتے پھرتے ہیں
تری نگاہ سے انجان اڑتے پھرتے ہیں
زمیں کے پاس کشش کا تری جواب کہاں
فقیر لوگ تو ہر آن اڑتے پھرتے ہیں
ہمارے ہاتھ کوئی کنکری ہی لگ جائے
پروں کے زور پہ شیطان اڑتے پھرتے ہیں
اٹھائے جگنو کی مانند روشنی کا بوجھ
ہم اپنے آپ سے انجان اڑتے پھرتے ہیں
سنائی دیتی ہے سات آسماں میں گونج اپنی
تجھے پکار کے حیران اڑتے پھرتے ہیں

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

ختم سارے مرحلے اب پیش وپس کے ہو گئے
گھر سے ہم اکتا کے نکلے اور جرس کے ہو گئے

لہلہاتی فصل نے احوال تک پوچھا نہیں
کتنے بے توقیر یہ بادل برس کے ہو گئے

راکھ سے اپنی دوبارہ ہم کو لینا تھا جنم
اس نے جانا ہم اچانک خاروخس کے ہو گئے

راہ اپنائی تھی کوئی تو ترے جانے کے بعد
عشق سے فرصت ملی تو ہم ہوس کے ہو گئے

تیزتر لمحوں نے آکر چھو لیا کچا بدن
دیکھتے ہی دیکھتے ہم سو برس کے ہو گئے

مانتا ہوں مہرباں ہے آفتاب اس پار کا
میں بھی تو سایہ نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

کون سا ہم سرمد و منصور ہیں، خوش آمدید!
راستہ روکا ہے کس نے آپ کی تلوار کا

دوستوں کی مہربانی سے ہوئی ہے پائمال
میری مٹی میں بھی تھوڑا خون ہے قندھار کا

درمیانی راستے ہیں بزدلوں کے واسطے
اپنا ہر جھگڑا ہوا ہے آر کا یا پار کا

چومتا ہے خون میں ڈوبے ہوئے ہاتھوں کو بھی
کم سے کم اک آدمی تو ہے یہاں کردار کا

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

کرم یہ حیرت نادید سے زیادہ ہے
تعلقات کی تجدید سے زیادہ ہے
جھلس کے رہ گئے ہم سائبان والے بھی
یہ دھوپ شام کی تمہید سے زیادہ ہے
تمہارے سحر میں اس درجہ ڈوبنا میرا
خود اپنی ذات کی تردید سے زیادہ ہے
میں احترام کی حد سے گزر نہیں سکتا
یہ بے ضمیری تو تقلید سے زیادہ ہے
اسے بھی دل نے کوئی اہمیت نہیں دی کل
یہ احتیاط تو تاکید سے زیادہ ہے
تمام عمر لکھا اپنے ہی لئے میں نے
مرا سخن کسی تائید سے زیادہ ہے

ہماری دنیا جہاں تک تری نظر میں ہے
نہ جانے کون سے آسیب کے اثر میں ہے
چمک رہا ہوں ستارے کی طرح میں کب سے
مگر وہ آنکھ کسی اور ہی بھنور میں ہے
میں آفتاب کی اک اک کرن سے ڈرتا ہوں
عجیب برف جمی میرے بام و در میں ہے
پتہ چلے گا ہوا کو کب اپنی منزل کا
کبھی شجر میں کبھی دشت بے شجر میں ہے
خبر ہے کل کئی شہروں کے ڈوب جانے کی
مگر ندی کا کنارہ تو میرے گھر میں ہے
وہ صاف صاف بھی کرتا ہے گفتگو اکثر
مگر وہ بات کہاں جو اگر مگر میں ہے

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

خواہش کہ مارا مارا پھرے اور گھر نہ جائے
یہ فکر بھی کہ رونق دیوار و در نہ جائے

ہے رنگ و بو غضب کا مگر اس کے بعد کیا
یہ پھول مجھ کو اور بھی ویران کر نہ جائے

اب اپنی سخت جانی سے میں تنگ آچکا
یہ پل بھی انتشار کا یوں ہی گزر نہ جائے

تب تک جنوں کو رکھے رہو اختیار میں
جبتک نظر کا آئینہ چہروں سے بھر نہ جائے

کچھ اور سوچنے کی اجازت تو مل گئی
لیکن ترے خیال کا چہرہ اتر نہ جائے

بدلی فضا تو سوچ کے ڈھب بھی بدل گئے
ڈرنے لگے ہیں لوگ کہ دریا اتر نہ جائے

اس کا کوئی قصور نہیں پھر بھی جانے کیوں
آئینہ ڈر رہا ہے نظر سے اتر نہ جائے

زرد یادوں سے بھر دیا ہے مجھے
رت نے ویران کر دیا ہے مجھے

ہفت افلاک سیر کی خاطر
قید رہنے کو گھر دیا ہے مجھے

چکھ لیا اس نے پیار تھوڑا سا
اور پھر زہر کر دیا ہے مجھے

جانے کیا کیا میں دیکھ لیتا ہوں
کس نے آنکھوں سے بھر دیا ہے مجھے

مجھ سے ٹکرا دیا ستارے کو
رات نے چور کر دیا ہے مجھے

اتنا خالی نہیں رکھا اس نے
لمس بھی خواب بھر دیا ہے مجھے

کام ہی کیا تھا چاہنے کے سوا
تم نے بیکار کر دیا ہے مجھے

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

تصویر پھینک دیجئے چہرہ نہیں ہوں میں
جیسا دکھائی دیتا ہوں ویسا نہیں ہوں میں

تنہائی بانٹنے کو ملے آستیں کے سانپ
یارب ترا کرم ہے اکیلا نہیں ہوں میں

بدلا ہے میرے ساتھ زمانے نے رنگ ڈھنگ
دنیا کے ساتھ ساتھ تو بدلا نہیں ہوں میں

لعنت سے میں بچا رہا صبر و سکون کی
اچھا ہوا کہ آج کسی کا نہیں ہوں میں

جو شخص چاہے آکے مجھے مسترد کرے
فرمان کوئی یا کوئی فتویٰ نہیں ہوں میں

چلتا ہے کس کا زور کھلے آسمان پر
پہرے لگا کے دیکھئے اونچی اڑان پر

قالین قیمتی ہے پہ میری خطا معاف
ہے رقص کا مزہ تو پھسلتی چٹان پر

اب بانسری بھی ان کی رضا سے بجایئے
ورنہ وہ قہر ڈھائیں گے ایک ایک تان پر

کیا پہلی بار اس نے دکھایا ہے دل مرا
کیا ہو گیا کہ آج بن آئی ہے جان پر

کچھ اور بڑھ گیا مری تنہائیوں کا دکھ
چمکیلے پھول کھلنے لگے آسمان پر

☆☆

نعمان شوق

غزلیں

کچھ بھی کر سکتا ہوں میں لوٹ کے جانے کے سوا
کوئی چارہ نہیں دل اس کا دکھانے کے سوا

کب چراغوں سے کوئی کام لیا جائے گا
کیا کیا آپ نے بھی گھر کو جلانے کے سوا

کوئی تو نالہ شب گیر پہ باہر نکلے
کوئی تو جاگ رہا ہوگا دوانے کے سوا

اور مت دیکھئے اب عدل جہاں گیر کے خواب
اور کچھ کیجئے زنجیر ہلانے کے سوا

باغ کی سیر سے کیا فائدہ ہونا تھا مجھے
کچھ بھی تو چن نہ سکا اوس کے دانے کے سوا

حد تو یہ ہے کہ وہ ناکام رہا اس میں بھی
اور کیا کرنا تھا اب مجھ کو بھلانے کے سوا

پھر کوئی آذر اٹھے گا خاک سے
پربتوں کا سر اٹھے گا خاک سے

چاک کی رفتار دیکھ اے کوزہ گر
خواب سا اک گھر اٹھے گا خاک سے

یاد رکھ توڑا ہوا ایک ایک پھول
بد دعا بن کر اٹھے گا خاک سے

سانپ کے کچلے ہوئے سر مت گنو
کل نیا اک ڈر اٹھے گا خاک سے

چاند تاروں کی طرف مت دیکھئے
خوشنما پیکر اٹھے گا خاک سے

ایک دن بدلے گی یہ دنیا ضرور
اک نیا منظر اٹھے گا خاک سے

☆☆

سلطان اختر

رباعیاں

(مظہر امام کے نام)

ہر عہد میں شاداب گلستاں تیرا
صد رشک چمن ہے چمنستاں تیرا
ہر طرح کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے
خالی نہیں دیکھا کبھی داماں تیرا

☆

پھولوں سے نکھرنا تجھے آتا ہے امام
کانٹوں سے گزرنا تجھے آتا ہے امام
اخلاص و مروت کا سراپا تو ہے
ہر دل میں اترنا تجھے آتا ہے امام

☆

نظموں میں جو روشن ہے فسوں تیرا ہے
صحرائے غزل میں بھی جنوں تیرا ہے
ہر بند میں چستی ہے تو ہر شعر سبک
کہنے کا جو انداز ہے یوں تیرا ہے

☆

ہر ایک سخن خندہ و شاداں تیرا
سرسبز ہی دیکھا ادبستاں تیرا
غزلیں ہوں کہ نظمیں ہوں کہ آزاد غزل
ہر صنف میں ہے رنگ نمایاں تیرا

☆

تنہائی کا دم بھرتا ہے بے کار امام
ہر بزم میں ہیں تیرے طرفدار امام
مخمل کی طرح نرم طبیعت تیری
آئینہ خوبی ترا کردار امام

☆☆

میرے نقطہ نظر سے

داماں باغباں

مرتب

قرۃ العین حیدر

ناشر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

صفحات : ۶۸۳

یہ ان خطوں کا مجموعہ ہے جنہیں قرۃ العین حیدر نے ترتیب دیا ہے اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے۔

پیش لفظ کے بعد جن دو اہم ترین شخصیتوں کے خطوط شامل ہیں ان میں ایک تو سر سید احمد خاں (بنام میر بندے علی) اور دوسرے علامہ اقبال (بنام سید سجاد حیدر یلدرم) ہیں۔ اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم کے نام وہ خطوط ہیں جو انگریزوں نے انہیں لکھے ہیں۔ ان کی تعداد پانچ ہے۔ بعد ازیں سید سجاد حیدر یلدرم و شمس العلما مولوی سید ممتاز علی کے مابین مراسلاتی سلسلہ ہے۔ دوسرا سلسلہ سید میر ظہور حسین بنام سید ممتاز علی ہے۔ یلدرم کے نام سات مکتوب نگاروں کے خط ہیں جن میں ایک انگریز بھی ہے۔ مس نذر الباقر کے نام چھ مکتوب نگاروں کے خط ہیں۔

خطوط بنام نذر سجاد۔

اس ذیل میں ایک تو وہ خط ہیں جو فلا ئنگ آفریدی نے اپنی دختران نذر سجاد اور ثروت آرا افضل علی کے نام لکھے ہیں۔ پھر مکتوب نگاروں میں مردوں کے علاوہ خواتین بھی ہیں۔ اس کے بعد نذر سجاد کے وہ تین خطوط ہیں جو انہوں نے خواجہ غلام السیدین وصل بلگرامی اور رازق الخیری کے نام لکھے ہیں۔

مراسلات بنام قرۃ العین حیدر میں الف تا ی کل ۱۶۲ مکتوب نگاروں کے نام آتے ہیں جن میں ایک انگریز بھی ہے۔

کتاب کے مطالعے کے دوران میں نے کچھ نوٹس لئے ہیں جو درج ذیل ہیں :

ص ۱۷۷- آزدری جرمن نژاد ملیالی رقاصہ تھی (جس کا نام ایلیٹ گزیل تھا، لیکن جب خالدہ ادیب خانم ہندوستان تشریف لائیں تو انہوں نے اس کا نام آزدری (یقینی یہ ایک بامعنی لفظ ہوگا) رکھ دیا۔

حکیم یوسف حسن نے "نیرنگ خیال" میں انہیں دنیا کی دس بہترین رقاصاؤں میں شمار کیا تھا۔

ان کی شہرت فلم "باغی سپاہی" سے ہوئی تھی۔

لیکن مجھے ان کی فلم "من کی جیت" یاد آرہی ہے جس میں جوش صاحب کے ایک گیت پر انہوں نے اپنا رقص دیا تھا۔ یہ ۴۴ء-۴۵ء کی بات ہے۔

ص ۲۰۷- شہید سروردی کے دور میں صوبے کے سربراہ Premier کہلاتے تھے، چنانچہ اے کے فضل الحق، سر ناظم الدین، سر سعد اللہ اور مسٹر محمد یونس، یہ سبھی لوگ برطانوی دور میں مختلف صوبوں کے سربراہ رہ چکے تھے اور Premier کہلاتے تھے۔

ص ۱۷۲- پر جاوید اقبال قرۃ العین حیدر کو لکھتے ہیں :

...... میرا ایک بھانجہ ہے ..... آپ کو رابعہ بصری سے کم نہیں سمجھتا۔

اسی طرح جون ایلیا نے بھی اپنے خط میں انہیں رابعہ بصری سے مماثل قرار دیا ہے۔

رابعہ بصری سے وہ جو واقعہ منسوب ہے کہ کعبہ ان کے استقبال کو نکل کھڑا ہوا تھا (مولانا آزاد نے "غبار خاطر" میں ایک اور روایت لکھی ہے) تو مجھے سن کر ہمیشہ یہ شعر یاد آجاتا ہے :

اے تماشہ گاہ عالم روئے تو
تو کجا بر تماشہ می روی

ص ۱۷۳- پاکستان کے کسی رسالے میں ن۔ م۔ راشد کے سلسلے میں یہ بات آئی تھی کہ جب ان کی کیتھولک ساس کا انتقال ہوا تو لاش کو Electric Elemenator میں جلایا گیا۔ اور اس سارے عمل کو راشد صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد یہ کہا تھا کہ یہ بڑا ہی Hygenic طریقہ ہے، مجھے بھی مرنے کے بعد اسی طرح جلا دینا۔ سوئے اتفاق کچھ ہی دنوں بعد راشد صاحب کا بھی یورپ کے اسی شہر میں انتقال ہو گیا اور عین ان کی خواہش کے مطابق انہیں بھی جلا دیا گیا۔

عصمت چغتائی تو اپنے آخری زمانے میں بالکل ہی Senyl ہو چکی تھیں، چنانچہ ان کے ایک نواسے نے جو ایک شدت پسند ہندو تنظیم سے منسلک تھا، ان سے ایک ایسے کاغذ پر دستخط کرایا تھا جس میں یہ

تحریر سے درج تھی کہ انہیں مرنے کے بعد نذر آتش کر دیا جائے۔ یوں مرنے کے بعد انہیں جلا دیا گیا۔

یہ عینی صاحبہ کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو ہے کہ انہوں نے 'موتا بالخیر' کے دینی احکام کا خیال کرتے ہوئے، دونوں کے گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ص ۴۵۱-'دسنوی' سے اگر ڈاکٹر سید محمود کی مراد شہاب دسنوی سے ہے تو وہ صباح الدین عبدالرحمٰن کے بھانجے تھے۔

ص ۴۶۷-(شکیلہ آپا کے خط کا حاشیہ) گڑیا، تو چھوٹی لڑکیوں کے لئے پوری اردو دنیا میں بولا جاتا ہے، البتہ بہار میں چھوٹی بچیوں کو 'بنی' بھی بولتے ہیں۔ اس طرح سہرام کے علاقے میں چھوٹی بچیوں کو 'میاں' کہا جاتا ہے۔

ص ۵۴۱-پر جو نوٹ ہے اس کا خط سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ص ۶۵۵-یہ (نیر مسعود کے خط کے حوالے سے) وہابی تحریک کے بانی عبدالوہاب نجدی ہیں، جنہوں نے ابنِ تیمیہ کے کاموں کی توسیع اور تجدید دونوں کی ہے۔ کمپوزیشن کی غلطیوں سے مصرعوں اور شعروں کی تو ہیئت ہی بگڑ گئی ہے۔

ص ۶۰۱-(لطیف الزماں کے خط میں) میر کے مقطع کو یوں ہونا چاہئے تھا:

دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

میر صاحب زمانہ نازک ہے

ص ۵۲۱-اکبر علی خاں عرشی زادہ نے جو میر کا مقطع تحریر کیا ہے۔ کمپوزیشن کے بعد وہ ایک معمہ بن گیا ہے:

اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو

تم بھی تو میر صاحب وسیلہ فقیر ہو

'وسیلہ فقیر' کی ترکیب میں نے پہلی بار دیکھ کر ایک قدیم خانقاہ کے صاحب سجادہ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ مصرعہ ثانی بھی محل نظر تھا کہ خدائے سخن میر کے یہاں مصرعہ کی 'ب' گرتی ہو یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ تھک ہار کر میں نے فیصلہ کیا کہ میر کا کلیات دیکھا جائے۔ چنانچہ میر کے دیوان میں متعلقہ غزل مل گئی۔ مقطع یوں تھا:

اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو

تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

ص ۶۶۸ - وارث کرمانی نے ایک مقطع لکھا ہے :

تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زرفشانیاں ترے رخ کی کدھر گئیں

یہ مقطع منیر شکوہ آبادی کا تو ہو ہی نہیں سکتا، یقیناً منیر نیازی کا ہوگا۔ اس مجموعے کا طویل ترین خط وارث کرمانی کا ہے اور مختصر ترین مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہے۔ صرف ایک سطر کا خط۔

ان خطوں میں قرۃ العین حیدر کے جس ناول کا بار بار ذکر آیا ہے اور جسے ''آگ کا دریا'' سے بھی زیادہ پسند کیا گیا ہے وہ ہے ''گردش رنگ چمن''۔ ''میرے بھی صنم خانے'' کی تہذیبی فضا (لکھنو اور بارہ بنکی) کم وبیش ان کے ہر ناول میں مل جاتی ہے۔ لیکن یہ ناول بے حد Eventful ہے اور انسانیت کو جینے کے ایک نئے انداز سے روشناس کراتا ہے۔

ان خطوں سے عینی صاحبہ کے سلسلے میں جو ایک مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دل میں انسانیت کا بے پناہ دکھ درد ہے۔ وہ وسیع القلب، وسیع النظر اور صاحب عزوجاہ ہیں۔

—— بے حد ہر دل عزیز،

حسن نعیم کی ایک غزل (در مدح قرۃ العین حیدر) کا یہ شعر مجھے یاد آرہا ہے :

جس نے ہر لفظ کو موتی سے گراں سمجھا ہو
اس کو کیا شاہ صدف گوہر دیدہ لکھوں

احمد یوسف، پٹنہ

تاثرات

قیمت : ۱۰۰/روپے، صفحات : ۱۲۸

مصنف
نسیم اختر

ناشر
سلسلہ، پٹنہ

''تاثرات'' ڈاکٹر نسیم اختر کے منتخب مضامین کا مجموعہ ہے۔ یوں تو اس سے پہلے بھی ان کی چند کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ لیکن 'تاثرات' کے تمام مضامین نسیم اختر کو دبستان عظیم آباد کے صاحبان قلم کی اولین صف میں لا کھڑا کر دینے کے لائق ہیں۔

پہلا مقالہ ''کربل کتھا کی دریافت'' ذیلی محققانہ تخلیق ہے۔ دوسرا مقالہ میر تقی میر کی زندگی اور کلام کے چند متضاد پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ میر پر ہر صاحب نظر نے قلم اٹھایا ہے۔ مگر یہ مقالہ تضاد کے دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈال کر میر صاحب کے ''عبوسا قمطریرا'' مزاج کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ تیسرا مقالہ پڑھ کر یہ خوشی ہوئی کہ نسیم اختر کو ہندی زبان وادب سے کافی دلچسپی ہے اور شتر وگربہ کا بہترین تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ مگر بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے۔ چوتھا مقالہ ''امراؤ جان ادا: حقیقی یا فرضی'' ایک ایسا عنوان ہے جس کا فیصلہ ایک صدی تک نہ ہو سکا تو اب اس کے آگے کی صدیاں کیا فیصلہ کر پائیں گی۔ ہاں! اگر ادبی ماحول سے نکل کر رسوا کو کسی اور ماحول میں تلاش کیا جاتا تو یہ معاملہ کب کا طے پا چکا ہوتا۔ یہ بحث طویل اور بہت طویل ہے۔

نسیم اختر نے غیاث احمد گدی کے افسانہ ''پیسہ'' کا بہترین نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ہر فنکار کی شاہکار تخلیق وہی ہوتی ہے جس میں وہ خود شریک رہتا ہے یا ذاتی تجربہ ہو چکا ہوتا ہے۔ کرداروں کا فرضی نام کچھ بھی رکھ لیا جائے مگر حقیقت کا پردہ ضرور فاش ہو جاتا ہے۔ ''پیسہ'' کو وہ ناقدین مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں، جو زندگی میں لذت عشق سے دوچار نہیں ہوئے ہیں۔ اب اس کے آگے کچھ لکھنا گویا حدادب سے تجاوز کرنا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے بارے میں ان کے آزاد قلم کے حوالے سے جو کچھ بھی لکھا ہے، ٹھیک ہی ہے۔ البتہ پہلے پیراگراف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وراثت بھی ایک فطری عمل ہے جس سے اولاد در اولاد ضرور متاثر ہوتی ہے۔ اور خاندانی ہونا باعث شرف وافتخار وصف ہے۔ اس تحریر سے نسیم اختر کی حقیقت پسندانہ طبیعت و مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

دوسروں کی تحریروں کا طویل طویل حوالہ فنکار کی شخصیت کو مجروح کرتا ہے۔ ایسی غلطی دیگر مقالوں میں بھی ہے۔ ہاں ایک دو جملے ہوں تو درست ہے۔ ادب میں طفلیلیت مناسب نہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کی یاد میں جو کچھ بھی لکھا ہے، آئندہ کے لئے دستاویز ہے۔ میں نے بہت پہلے نسیم سے ان کی اس ملاقات کا تذکرہ ان کی زبانی سنا تھا۔ اس وقت وہ تازہ تازہ ملاقات کر کے آئے تھے۔ آج جب ''تاثرات'' میں اسے رقم شدہ دیکھا اور پڑھا تو نسیم اختر نے کہیں پر بھی خود نمائی کی خاطر ایک لفظ کیا، ایک حرف کا بھی اضافہ نہیں کیا۔ بلکہ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ بعض اہم جزئیات کو بھی پیش نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ مقالہ طویل نہ ہو جائے۔ بہر حال نہایت دلکش انداز میں یہ انٹرویو تحریر کیا ہے۔ اشک جیسے

پر شکوہ فنکار، اشک ہی کی طرح جب اقتصادی بار کی زد میں آتے ہیں تو گمنامی کے اندھیروں میں دھکیل دیے جاتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ نسیم اختر نے اشک کا انٹرویو لے کر بڑے بڑے شہرت یافتہ مصنوعی ادباء و شعرا کے منہ پر طمانچہ مارا یا نہیں؟ لیکن ہر عہد کی ناقدرداں حکومتوں اور سرکاروں کی مٹی ضرور پلید کی۔

کلیم عاجز کے لہجہ کی بات ہے تو سنئے، کلیم عاجز شاعری کے جملہ لوازم سے آراستہ و پیراستہ شدہ ۱۹۴۶ء میں تلہاڑا سے پٹنہ گئے۔ جب کہ گھر نذر آتش، اہل خانہ کی خانہ ویرانی، بے سروسامانی، سر پر کوئی مرد سرپرست نہیں۔ سبھوں کی کفالت و نگرانی کے ذمہ دار، یک طرفہ فرقہ وارانہ غارت گری کے شکار، اس وقت پچیس تیس سال سے زائد عمر کے نہ تھے جن حالات سے وہ گزرے ویسی صورت میں انہیں کلیم عاجز ہی بننا تھا۔ نسیم اختر نے کلیم عاجز کے لہجے کے سلسلے میں حقائق پیش کر دئے ہیں فیصلہ قارئین کریں۔

''نیپال میں اردو کے اثرات''اس کتاب کا اختتامی مقالہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جائے تو بجا ہے کہ جس طرح کسی افسانے کا نقطہ عروج ہوتا ہے بعینہ یہ مقالہ نسیم اختر کے ''تاثرات'' کا نقطہ عروج ہے اور افسانہ ہی جیسی تشنگی بھی محسوس ہوتی ہے کہ جیسے بات ادھوری رہ گئی ہو۔

آخر میں یہ عرض کر دوں کہ اللہ جمیل یحب الجمال۔ حسن اللہ کو بھی بھاتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بندہ سنت الٰہی کی پیروی نہ کرے۔ ''تاثرات'' کی ظاہری شکل و صورت بھی بہت عمدہ ہے جو نسیم اختر کے ذوق سلیم کی مظہر ہے۔

ناصر زیدی، پٹنہ

محاسبہ

قیمت: ۱۰۰ر روپے، صفحات ۲۲۲

مصنف — مرتب اور ناشر

قیوم خضر — اظہار خضر، سیٹی کورٹ، پٹنہ ۷

''محاسبہ'' جناب قیوم خضر کا جیون درپن ہے جسے ان کے لائق فرزند اظہار خضر نے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔ اظہار خضر کے مقدمہ کے بعد معروضات کے تحت اپنی خود نوشت کے بارے میں قیوم خضر نے بڑی صاف گوئی سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی سوانح عمری میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے تاریک راہوں کو اجالے کی نعمت میسر آسکے۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ اپنی جن

کمزوریوں، کوتاہیوں، خامیوں، بے راہ رویوں اور غلطیوں کے تذکرے ان صفحات میں کئے گئے ہیں، اگر پڑھنے والے پڑھیں گے تو وہ ان آلودگیوں سے اپنے دامن حیات کو بچا سکیں گے۔ ایسی صاف گوئی کسی اور سوانح میں کہاں ملتی ہے۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ بعض واقعات و حالات ایسے ہوتے ہیں جن کا برملا اظہار ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ صاف صاف کھول کھول کر بے کم و کاست بعض باتوں کو لکھ دینے میں ہماری سماجی روایات کے علاوہ اور بھی دوسری رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے ایسی بات سے بھی پرہیز کیا ہے جس کا تعلق ان کی ذات سے نہیں ہے۔

پہلے باب میں انہوں نے بچپن سے لے کر جوانی کے حالات قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ دسمبر ۱۹۲۴ء میں گیا شہر، پھلگو ندی کے کنارے موریا گھاٹ محلہ میں ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کے گھرانے کے افراد بڑے پیمانے پر تجارت کیا کرتے تھے اور انہیں اس زمانے میں سماجی وقار بھی حاصل تھا۔

اردو کے مشہور مزاح نگار انجم مانپوری جن کا اصل نام شیخ نور محمد تھا، ان کے دادا جناب شیخ دلاور حسین کے سب سے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے بارے میں بھی قیوم خضر نے کافی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور انجم صاحب کی بذلہ سنجی کی بھی کئی مثالیں انہوں نے پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ اس زمانے کے ادبی اور سیاسی حالات اور مشاعرے کی روداد بھی ملتی ہے۔

قیوم خضر کی ادبی اور سیاسی دلچسپیوں کا آغاز ۱۹۴۰ء سے ہی ہو گیا تھا۔ ادبی دلچسپیوں کے جنون نے ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ "اشارہ" کا اجرا کرا دیا۔ "اشارہ" کے کئی یادگار شمارے بھی شائع ہوئے۔ اس کا دوبارہ اجرا ۱۹۵۳ء پٹنہ سے ہوا۔

ان کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے نو سال کی عمر میں گلستاں بوستاں کو بامعنی حفظ کر لیا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستہ و برمحل گفتگو کی بھی مثالیں اس کتاب میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اکثر گالیوں کا بھی فراوانی سے استعمال کیا کرتے تھے۔ اپنی اس عادت کو انہوں نے اپنے منجھلے دادا شیخ وزیر علی مرحوم کے "لعاب دہن کا صدقہ" بتایا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے ذکر کیا ہے کہ "دشنام طرازی کے علاوہ دوسری عادت ایسی ہے جس نے مجھے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور وہ ہے غصہ میں آپے سے باہر ہو جانا۔"

کتاب کے دوسرے باب میں انہوں نے اپنی ادبی کاوشوں کا ذکر کیا ہے اور اس زمانے کے ادبی حالات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے ناقدری علم و فن اور بے مہری زمانہ کی شکوہ سنجی کو دانشوروں

کی تقدیر بتائی ہے۔انہوں نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔انہوں نے ۳ راگست ۱۹۴۳ء کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جب سر یکابری مینائی کی خدمت میں اپنے دو قطعے اصلاح کی غرض سے پیش کئے تھے۔اسکے حاشیے پر استاد مکرم نے تحریر کیا تھا" یہ قطعے کسی اور کے ہیں۔اتنا صاف اور اچھا ابھی آپ نہیں کہہ سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دماغی دھوکا ہو گیا ہے۔"استاد کی یہ تحریر ان کیلئے بہت بڑی سند کا درجہ رکھتی ہے۔

تیسرے باب میں انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کی تفصیلات اور پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ماہنامہ "اشارہ" کا اجرا تو گیا سے ہی ۱۹۵۰ء میں ہو گیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۷۵ء تک جاری رہا۔۱۹۵۹ء میں جب وہ پٹنہ آئے تو"اشارہ" یہیں سے شائع ہوتا رہا۔اس دور میں انہیں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی سپر نہ ڈالی۔انہوں نے ذکر کیا ہے کہ "آسانیوں اور خوش حالیوں کے ہزاروں راستے موجود تھے مگر دل ایذا طلب ان کی طرف راغب نہ تھا۔"اخبار نکالنے کے لئے دفتری طور پر کن اذیت ناک درد سے گذرنا پڑتا ہے اس کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں انہوں نے اپنے سیاسی حالات کا ذکر کیا ہے۔سیاسی اتھل پتھل کا ذکر کرتے وقت ان کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا ہے۔کتاب کے پانچویں باب میں انہوں نے زندگی بھر کے تجربات، مشاہدات اور مطالعات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔حالات کی کرب ناکیوں نے قیوم خضر کو جسمانی اور دماغی طور پر پریشان ضرور کیا مگر ان کا دل بہت پر سکون رہا،اسے ایک اطمینان بھی حاصل رہا۔وہ اپنی زندگی سے شاکی ہونے کی بجائے اس سے مطمئن نظر آتے ہیں۔

عام طور پر سوانحی خاکہ میں لوگ خود کو بڑھا چڑھا کر خود ستائی کی حد تک اپنے خاندان والوں کی تعریف کرتے ہیں اور دوسروں کی تضحیک کا پہلو بھی تلاش کر لیتے ہیں۔قیوم خضر کی سوانح میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔انہوں نے اپنی کمزوریوں کا جس طرح بر ملا اظہار کیا ہے اس سے ان کی کسر نفسی کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ جس محفل میں بھی ہوتے وہاں سے سنجیدگی رخصت ہو جاتی۔کبھی کبھار تو محفلوں میں لوگ ان کی آمد سے ڈر بھی جاتے کہ کون جانے کس کے بارے میں وہ کیا کہہ دیں گے۔

ان کی سوانح عمری پر مشتمل یہ کتاب عام سوانح عمریوں کی بھیڑ میں ایک اضافہ ہے۔اس میں اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور ادبی حالات کا بھی ایسا تاریخی ذکر ملتا ہے جس سے وہ دور اپنی پوری سچائیوں کے ساتھ روشن ہو جاتا ہے۔

اظہار خضر بلاشبہ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بغیر کسی مالی تعاون کے ۲۲۲ صفحات کی

اتنی خوبصورت کتاب صرف ایک سو روپے میں پیش کی ہے۔ مکتبہ اشارہ، سیٹی کورٹ، پٹنہ ۷ سے یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔

مشتاق احمد نوری، پٹنہ

عراق کا سفر نامہ　　　قیمت : ۲۰۰/ روپے، صفحات ۱۱۲

مصنفہ　　　ناشر

زینت مسعود زینب　　　ساشا پبلی کیشنز، ۱۰۱ T، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۳۱

اردو میں بہت سارے سفرنامے لکھے گئے ہیں اور آئندہ بھی لکھے جاتے رہیں گے لیکن جس بے تکلفی کے ساتھ زینت مسعود صاحبہ نے عراق کا سفر نامہ لکھا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی زبان سادہ اور اسلوب رواں ہے۔ زبان و بیان کی بعض لغزشیں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں، جن کی اصلاح دوسری اشاعت میں ممکن ہو سکے گی۔ مشرف عالم ذوقی نے سفر نامہ کے آغاز میں ایک پر لطف مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مصنفہ "ہم جو کچھ ہیں، ہم جیسے ہیں، ویسے ہی دکھائی دیتے ہیں" کا عملی نمونہ پیش کرنے پر اصرار کرتی ہیں اور یہ اہم بات ہے۔

اس سفر نامہ کی بعض خصوصیات بیک نظر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ سفر نامہ معلوماتی ہے اور عراق کی دو مختلف تہذیبوں اور ان کے نتیجے میں ابھرنے والی سماجی و ثقافتی صورت حال کو پیش کرتا ہے۔ مصنفہ نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ خود اپنی ذات کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح قاری عراق کے مختلف شہروں اور وہاں کی طرز رہائش کا براہ راست سامنا کرتا ہے۔ لیکن مصنفہ کے خیال میں تسلسل نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جو بات جس وقت ذہن میں آئی ہے وہ بغیر کسی ترتیب کے درج کر دی گئی ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب قابل تعریف ہے۔ مصنفہ کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ ان سے اور بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

اعجاز علی ارشد، پٹنہ

☆☆

نکتہ اور نکتہ داں

☆ تازہ رسالہ موصول ہوا تو خط لکھا۔ ملا ہوگا۔ آپکے رسالے کیلئے اردو کے کلاسیکی ادب کے ایک ممتاز شاعر ولی گجراتی کے احساس حسن پر میرا مضمون ہے۔ مزار ولی کو تو مسمار کر دیا گیا اس پر سڑک بھی بنا دی گئی اور اس پر ایک عدد مندر بھی بنادیا گیا اس مندر میں ایک بت بھی بٹھا دیا گیا لیکن ولی گجراتی کا دیوان زندہ ہے اور انشاء اللہ زندہ رہے گا۔

شکیل الرحمن ، گڑ گائوں

☆ آپ کا خط اور نیا "مباحثہ" ملا، ابھی پوری طرح پڑھ نہیں سکی۔ "مباحثہ" میں بہت اچھی کہانیاں، مقالے اور نظمیں آرہی ہیں۔ شموئل احمد کا ناول پورا پڑھنے کے بعد رائے دوں گی۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یقیناً یہ بہت اچھا ناول ہوگا۔ آج ہمارے آس پاس پھیلے ہوئے مسائل لکھنے والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں پر یہ اعتراض تھا کہ وہ وقتی سیاسی موضوع پر توجہ دیتے ہیں مگر آج پھر وہی دور ہے جب دور کھڑے ہو کر انسانی جذبات کو ٹٹولنے کے علاوہ بھی ادیب اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں۔ ادب کے ایسے ہی بدلتے ہوئے دھاروں کے بیچ میں نے آندھرا پردیش کے بندھوا مزدور پر "بارش سنگ" لکھی تھی۔ ماسکو یونیورسٹی میں دل دوسو کولون نے روسی زبان میں اس ناول پر ڈاکٹریٹ کیا ہے، ۱۹۸۳ء میں۔ شاید آپ نے وہ ناول پڑھا ہو۔ اس ناول کا ترجمہ روس میں ہوا ہے۔ انگلش، ہندی، مراٹھی اور تلگو میں بھی ہوا ہے۔ اب ایک کنڑ ادیب اس کا ترجمہ کنڑی میں کر رہے ہیں۔ مراٹھی ادیبوں نے اس ناول پر پونا میں ایک میٹنگ کی تھی۔ قرۃ العین حیدر نے "بارش سنگ" پڑھ کر کہا کہ "یہ ناول موضوع گفتگو اس لئے نہیں بن سکا کہ یہ موضوع نقادوں کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"فائر ایریا" بھی اسی طرح نظر انداز کیا گیا، لیکن مجھے امید ہے کہ شموئل احمد کا ناول نقادوں سے اور نہیں پڑھنے والوں سے توجہ چاہے گا۔

جیلانی بانو، حیدر آباد

☆ "مباحثہ" کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ اس کرم کے لئے بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے میری غزل شائع کی اور اپنے گراں قدر جملوں سے مجھے نوازا، اس کے لئے مزید شکریہ، لیکن اس ضمن میں میں ایک عرض ضرور کرنا چاہوں گا، بھائی میں ہرگز ہرگز استادوں کی صف میں رکھنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے یہ استحقاق

اللہ بخشے، نہ کبھی تھا اور شاید نہ کبھی ہو گا۔ میں ایک طالبعلم ادب ہوں، سیکھنے کی سعی کرتا ہوں اور بعض اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہوں۔ میرے دل کا دامن بہت چھوٹا اور آپ کا حسن اخلاق بے حد بسیط اور گراں مایہ۔ بہر کیف، میں ایک بار پھر آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کرشن کمار طور، ہماچل پردیش

☆بہت دنوں سے "مباحثہ" کے تعلق سے اپنے تاثرات قلم بند کرنا چاہتا ہوں۔
جان لیوا حادثے کی اطلاع آپ نے اداریے میں دی اس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ بہار کے باہر کے دوستوں اور بڑے بھائیوں کو آپ کے رسالے کے ذریعے ہی اطلاع ملی۔ فون اور خط کا تانتا لگ گیا جس سے ذی فراشی کے اداس لمحوں میں بڑی تقویت ملی۔ "مباحثہ" کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوا۔ جس مشقت اور اپنائیت سے آپ نے میری اور سید محمد اشرف کی صحت یابی کے لئے دعائیں کی ہیں، اسے پڑھ کر آپ کی انسانیت اور فکشن نوازی کا قائل ہو گیا۔ ایک بار پھر آپ کی محبت کے لئے شکریہ۔

ڈاکٹروں نے سات ہفتے کے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اس مدت میں ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جائیں گی۔ چھ ہفتے گزر چکے ہیں۔ کرجی اسپتال کی فیزیو تھیرپسٹ مس ان جے لینا ورزش کرا رہی ہیں۔ دعا کریں کہ میں پہلے والے شوکت حیات کی طرح فعال ہو سکوں۔ یہ تاثرات بستر علالت سے نیم دازی کی حالت میں بڑی مشکل سے لکھ پا رہا ہوں۔

کئی لحاظ سے "مباحثہ" پسند آرہا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کئی شماروں میں خس وخاشاک کے انبار بھی اکٹھا ہوتے رہے ہیں۔ الم غلم چیزیں شان سے چھپ رہی ہیں سو یہ تو ہر پرچے کا مقدر ہے۔ جیسا اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے آپ انہیں میں سے تو انتخاب کریں گے۔ اور پھر کسی بھی فنکار کی کچھ ہی تخلیقات قدر اول کی حامل ہوتی ہیں، باقی سب کچھ کھوکھلی زندگی میں بورڈم کے ناگزیر لمحات کی طرح پرچوں میں Filler کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ اس کے علاوہ کرنا کیا ہے۔ بصورت دیگر پرچے انتہائی نحیف ضخامت کے حامل ہوتے چلے جائیں گے۔

آپ کی ایک بات مجھے بہت پسند آتی ہے کہ آپ اپنے اداریے میں تمام مشمولات پر اپنی پر مغز رائے ضرور دیتے ہیں۔ یہ ایک ایڈیٹر کا ادارتی منصب ہے کہ وہ اپنے طور پر قاری کیلئے کچھ تعارفی مواد فراہم کر دے تاکہ قاری اور فن پارے کے درمیان ایک پل کی تعمیر ہو سکے۔ بیشتر مدیر اس ذمہ داری سے اجتناب کے مرتکب ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فرض کو انجام دیتے ہوئے بعض کمزور تخلیقات اور مضامین کے

بارے میں آپ رطب اللسانی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بعض کے معاملے میں بخالت سے کام لیتے ہیں۔

اپنی کہانی "منحنی" پر مشتاق احمد نوری کا تجزیاتی مضمون پڑھا۔ اس تجزیے کے ٹولس کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔ جو کچھ نوری قلم برداشتہ ایک نشست میں لکھ لیتا ہے دوسروں کیلئے کئی کئی سٹنگ کی محنت میں بھی وہ ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کوئی چیز حرف آخر نہیں ہو سکتی۔ اگر نوری کو یہ جانکاری ہوتی کہ "منحنی" میری کہانیوں کا ایک مستقل کردار رہا ہے جسکے ڈانڈے میری پچوئشن سیریز کی کہانیوں اور دیگر کئی کہانیوں سے ملتے ہیں تو شاید اس تجزیے میں مزید گہرائی آجاتی اور غلط فہمیوں کے ارتکاب سے وہ محفوظ رہتے۔ یہ کردار میری کئی کہانیوں میں مختلف صورتوں میں متشکل ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے کی دیگر کہانیاں 'موم بتی پر رکھی ہتھیلی' شب خون میں 'پچوئشن ٦' جواز میں اور 'بے گھری' ذہن جدید میں شائع ہوئیں۔ بقیہ کہانیاں "الفاظ"، "تحریک" اور دیگر رسائل میں چھپیں۔ "منحنی" بظاہر ایک شخصیت ہے لیکن اصل میں یہ تغیر اور انقلاب کے پورے پراسس کا استعارہ ہے۔ انقلاب کبھی خط مستقیم میں نہیں آتا یہ ہمیشہ خط منحنی کی صورت میں بہت دھیرے دھیرے نمو کرتا ہے اور کبھی کبھی چشم زدن میں بارود کی طرح پھٹ پڑتا ہے۔ لینن کا مشہور قول ہے There is no straight line to revolution یہ انڈر اسٹوڈ ہے کہ Revo-lution always comes in zig zag way۔ مذکورہ کہانیوں کا کردار (مرکزی) منحنی ہے جو جبر و استبداد کے خلاف احتجاج کی جوت جگا کر مظلومین اور مستحصلین کی تقدیر بدلنے کیلئے سرگرداں رہتا ہے۔ اس منحنی کا یہ کام نام نہاد جدید افسانوں کے ڈیڈ لاک کو توڑتے ہوئے ترقی پسند نعرہ باز اور فارمولا بند افسانوں کے مقابلے میں بے حد مشکل اور پیچیدہ ہے کہ اس نے اردو افسانے کے تقریباً سو سال پورے ہونے کے بعد یہ مشکل بوجھ کاندھوں پر نہیں بلکہ اپنے سینوں پر اٹھایا اور اسے اپنی روح، خون اور اپنی فکر کا حصہ بنایا ہے۔ وہ بھی پوری دیوانگی، بے خودی، کھلے پن اور انسانیت کے ساتھ باطنی وابستگی اور روحانی ہمدردی کے تحت، ادب کے ہمہ گیر فنی اوصاف کی پاسداری کرتے ہوئے۔

مشتاق احمد نوری سے ایک اور بات کہنی ہے کہ افسانہ نگار کی منطق کسی لفظ کے لغوی معنی کو پیش کرنے کی بجائے مختلف تخلیقی منطقوں کو محیط ہوتی ہے اور کبھی کبھی روایتی معنی کو Negate کرتے ہوئے معنی آفرینی کے بند دریچوں کو Explore کرتی ہے لفظوں کی روایتی اور لغوی معنویت کے خول کو توڑ کر انہیں نئی معنویتوں سے سرشار کرنا نئی تخلیق کاری، علامت نگاری اور استعارہ سازی کے بنیادی تخلیقی اصول ہیں جن کا اطلاق کبھی کبھی بظاہر سیدھی سادی عام سی نظر آنے والی کہانیوں پر بھی کسی سطح پر ہوتا ہے کہ ادب اور

افسانے میں اکہرا پن عموماً کوئی تخلیقی زاویہ نظر نہیں ہوتا۔ ہمیں تہہ داری اور کثیر الجہتی کے رویوں سے شاید کہیں مفر حاصل نہیں۔ اس اصول کا واقف کار منخنی کو کمزوری کی بجائے طاقت، احتجاج، امکان اور انقلاب کی ہمہ جہتی، سرسبزی و شادابی کے پیکروں میں ڈھلتے دیکھ کر مطالعہ خیزی کے نئے فرط و انبساط سے حظ اٹھائے گا۔ منخنی آخر کار Down trodden people کے لئے راہ نجات کے حصول کا سبب بنے گا۔

ویسے میں مشتاق احمد نوری کو اس ذہانت کیلئے داد نہ دوں تو یہ ناانصافی ہوگی کہ میری کہانی ''منخنی'' کا دو طرح سے تجزیہ کرکے اس نے میری کہانی کی ایک اور جہت دریافت کی ہے اور مناسب حربہ اختیار کرتے ہوئے اس کے کثیر الجہت اور تہہ دار ہونے کی توثیق کی ہے۔ مرکزی کردار کے منفی انداز میں تفہیم کے ذریعہ نوری نے اس کہانی میں ایک نیا پہلو ڈھونڈ لیا ہے۔ میں نے اس انداز میں تفہیم کے سلسلے میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تفہیم کی اس روش کا میں بہر حال استقبال کرتا ہوں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ نوری نے افسانے کی تنقید میں باریک بینی کے ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی ہے جس میں Wit, Satire اور سنجیدہ عناصر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہے کہ اس نے ہم عصروں پر بولڈ طریقے سے لکھنے کی ابتدا کی ہے۔ ایمان داری کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ میری دیگر مشہور کہانیوں 'بانگ'، ''گنبد کے کبوتر''، ''پاؤں''، ''ملی کا بچہ''، ''مادھو''، ''سانپوں سے ڈسنے والا بچہ''، ''بھائی''، وغیرہ کے تجزیے کی زحمت اٹھائے تاکہ میری افسانہ نگاری کے دیگر فنی و فکری پہلو اور ہمہ گیری بھی سامنے آسکیں۔

نوری کا شکریہ کہ اس نے ''منخنی'' میں مجھے کئی پہلوؤں سے بچا لیا (یعنی اس کہانی کی طاقت کا اعتراف بہر حال کیا) اور مجھ سے انصاف کرتے ہوئے میرے کہنے کیلئے گنجائشیں چھوڑ دیں۔ اس کا جو عمومی انتقادی رویہ ہے وہ تو میرے دوست افسانہ نگاروں کو بے پناہ کر دینے والا ہے۔ ظالم ایسی جگہ افسانے کو لاکر پٹکتا ہے جہاں افسانہ نگار کو بھاگ نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی لوجک جس پوزیشن سے افسانے پر سوالیہ نشان قائم کرتی ہے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کیلئے اس کا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے حشر کو دیکھ کر ذہنی فراشی کے عالم میں اضطراب سے گزر رہا ہوں۔ اللہ ان پر رحم کرے۔

کچھ شمارے جو فی الحال مجھے دستیاب ہیں، انکے تناظر میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، سید محمد عقیل، انور سدید، بلراج کومل، عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، سلیم شہزاد، ابرار رحمانی، حبیب حق، خورشید اکرم، اسلم جمشید پوری، قمبر علی، راشد انور راشد وغیرہ کے مضامین فکر انگیز معلوم ہوئے۔ علی احمد فاطمی کا مضمون ''منٹو کی حقیقت نگاری'' بطور خاص پسند آیا۔ فاطمی عموماً فکشن کے

موضوع پر محنت کر کے لکھتا ہے۔

افسانہ نگاروں میں جوگندر پال، شفیع جاوید، شفیع مشہدی، حسین الحق، شفق، زاہدہ حنا، ذکیہ مشہدی، عبدالصمد، قمر جہاں، م۔ق۔خان، شاہد اختر، عبید قمر وغیرہ نے متوجہ کیا۔

وہاب اشرفی کے مباحثے کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی یہ شفقت مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یونیورسیٹی کے نصاب میں شامل اپنی اہم کتاب "کہانی کے روپ" میں نئی نسل کے لوگوں میں سب سے پہلے انہوں نے میری کہانی "ڈھلان پر رکے ہوئے قدم" کو شامل ہونے کا اعزاز بخشا۔ وہ کہانی وہاب اشرفی کو بہت پسند تھی۔ ان کے مطابق زندگی، سفر، عزائم اور تگ ودو کی لاحاصلی کا کرب اس میں بڑے علامتی انداز میں مترشح ہوا تھا، اپنی پوری وسیع النظری اور بصیرت افروزی کے ساتھ۔ اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں میرے دوسرے دوستوں حسین الحق، شفق وغیرہ، کی شمولیت ہوئی تھی۔ یہ بات اس لئے یاد آئی کہ ذی فراشی کے عالم میں ایک دوست نے اس کتاب کا پرانا ایڈیشن مرحمت فرمایا۔

سلطان اختر کے دوسرے دور کی رباعیوں کی خاصی پذیرائی ہورہی ہے۔ جن ادیبوں پر وہ کرم فرما ہیں وہ کافی خوش ہیں۔ حالانکہ انکے پہلے دور کی رباعیوں میں تخلیقیت اور اختصاص کا عنصر کچھ زیادہ تھا۔ شموئل احمد کے ناول کے بارے میں ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

شوکت حیات، پٹنہ

☆ پوچھنا یہ ہے کہ آپ کیسے ہیں؟ "مباحثہ" نہیں ملا۔ خدا کرے نیا سال سکون و سلامتی کا سال ہو۔ دہشت گردی کے انسداد کے نام پر دہشت گردی نہ ہو، امن کے نام پر بم باری نہ ہو اس لئے کہ :

دہشت گری کا خاتمہ لازم تو ہے مگر　　　　وحشت میں مبتلا نہ ہو انسان دیکھنا

عاشور کاظمی، برمنگھم

☆ ایک تازہ مضمون روانہ کر رہا ہوں، کسی قابل ہو تو اگلے شمارے میں جگہ دے دیجئے۔

دہلی سے واپسی پر "مباحثہ" کا تازہ شمارہ ملا۔ پہلے آپ کا اداریہ پڑھتا ہوں جس سے پورے رسالے کا مزاج و مذاق سمجھ میں آجاتا ہے۔ دیگر مشمولات پڑھنے کے بعد اپنے تاثرات ضرور لکھوں گا۔ آج کل خوب لکھ رہا ہوں کئی مضامین ہوئے ہیں۔

علی احمد فاطمی، الہ آباد

☆ "مباحثہ" کا آٹھواں شمارہ کیا آیا فون کی گھنٹیاں لگاتار بجنے لگیں۔ سال کا پہلا فون بھائی شموئل احمد ہی کا تھا۔ سال نو کی مبارکباد کے ساتھ ڈھیر ساری "خان برانڈ" گالیوں سے نوازتے ہوئے کہا۔ "نورئے — تم

نے تو میرے سنگھار دان کو چور چور کر کے رکھ دیا۔" میرا جواب تھا"لوٹ کا مال تھا اور وہ بھی رنڈی پاڑے سے لوٹا گیا تھا، اسے تو چور ہونا ہی تھا۔ آپ کا ذاتی ہوتا تو اور بات تھی۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں، وہ موروثی سنگھار دان تھا اور بہت سی خوبیوں کا مالک تھا۔"

"مجھے تو کوئی خوبی نظر نہیں آئی۔"

"ارے تم نے اس نظر سے دیکھا ہی کب؟ آخر ہر کوئی اسکا یوں ہی دیوانہ تھا، جس نے بھی جھانکا وہ مست ہو گیا۔"

"میرے بھائی اس سنگھار دان میں سارے لوگوں کو سجی سنوری نسیم جان نظر آتی تھی۔ سب اسی کے جوبن کے سحر میں گم ہو جاتے تھے۔"

ادھر سے ایک بھرپور قہقہہ کی آواز آئی۔

"تم ٹھہرے ایک مولوی نما آدمی اسی لئے تمہیں اپنی ہی شکل نظر آئی۔"

"شاید ایسا ہی رہا ہو لیکن آئندہ کے لئے بن مانگا ایک مشورہ یہ دوں کہ آئندہ اگر اس طرح کا لوٹ مال پھر لانے کا اتفاق ہو تو اسے کسی ایسے پڑوسی کے گھر ڈال دیں جس سے پرانی دشمنی ہو۔"

ایک بھرپور قہقہے کے بعد بھائی شموئل احمد نے بتایا۔

"تمہارے تجزیے کی بہت گونج ہے اسے جاری رکھو۔ اب تمہاری زد میں کون آرہا ہے؟ یہ حسین الحق کا نمبر کب آئے گا؟"

سچی بات یہ ہے کہ کہانیوں کے ایسے بے باک تجزیے کے لئے شموئل احمد نے مجھے ورغلانے کی حد تک اکسایا اور ہمت بڑھائی۔ میرے سارے تجزیے شائع ہونے سے قبل شموئل احمد پڑھ چکے تھے۔ یہ بھی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ عبد الصمد اور شوکت حیات نے بھی اپنی کہانیوں کا تجزیہ پڑھ لیا تھا اور اسے شائع کرانے کی اجازت بھی دی تھی۔ عبد الصمد نے تو یہ تک کہا تھا کہ تجزیہ جارحانہ ضرور ہے مگر اسے شائع ہونا چاہئے۔ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا کہ وہ تجزیے کی گرفت میں ضرور آتے ہیں لیکن یہ کسی بھی طرح Prejudiced نہیں ہے۔ شائع ہونے کے بعد انہوں نے فون کر کے بتایا کہ اب لوگ ان کی مذکورہ کہانی تلاش کر کے پڑھ رہے ہیں۔ ایک بار انہوں نے بتایا کہ جناب وارث علوی نے فون کر کے انہیں کہا "تمہیں قتل کر کے وہ (نوری) سرخرو ہو گیا" پھر ہنستے ہوئے بتایا کہ بہت سے دوست یہ دریافت کر رہے ہیں کہ نوری کے تجزیے کے بعد آپ کی دوستی ان سے برقرار ہے؟

یہ تھی عبد الصمد کی فراخدلی۔ آج کون خود پر تنقید برداشت کرتا ہے؟ دل دکھے اور مسکراہٹ

جاری رہے یہ بڑی بات ہے۔

شوکت حیات اپنی تحریر کے سلسلے میں اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، لیکن انہوں نے بھی داد دی بلکہ یہاں تک کہا کہ میرے تجزیے سے ان کی کہانی کے ڈائمنشنز اور بڑھ گئے ہیں۔ لے دے کر ایک شفق تھے جنہیں ان کے "پھولوں والا مکان" کے کانٹے کے بارے میں جانکاری نہیں دے سکا اور یہ کانٹے انہیں بہت دور تک چبھ گئے، جیسا کہ ان کے دوستوں نے بھی اطلاع دی ہے۔ تجزیہ لکھنے کے بعد ایک بار اتفاق سے میں سہسرام گیا تھا اور انہوں نے اپنے پھولوں والے مکان میں تواضع بھی کی تھی، اس طرح دیکھئے تو یہ "نمک حرامی" کا کیس بن جاتا ہے۔ لیکن اسے کیا کیا جائے میں نے ان کے "بادل" کو بھی بہت نچوڑا لیکن ایک بوند پانی حاصل کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔

ویسے گزشتہ شمارے میں آپ نے بڑے پتے کی بات کہی تھی "تنقید متن کی طرح Stable نہیں ہوتی۔" یہ سچ بھی ہے۔ متن کی تخلیق تو ایک بار ہوئی تو ہو گئی۔ تنقید تو دسیوں طریقے سے ہو سکتی ہے، یہ تو زاویہ نگاہ پر منحصر کرتا ہے کہ کون کس زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ تازہ شمارہ میں آپ نے فرمایا ہے۔ "مشتاق احمد نوری افسانوں کے پوسٹ مارٹم میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اب تک جتنے افسانے ان کی زد میں آئے ہیں میری نگاہ میں سب کے سب زندہ ہیں۔" آپ کی باتوں سے اختلاف کرنے کی جرات میں کیسے کر سکتا ہوں، ہاں اگر خطا معاف ہو تو بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں کہ پوسٹ مارٹم تو ہمیشہ مردے کا کیا جاتا ہے یہ جاننے کے لئے کہ موت کی وجہ کیا ہے۔ چونکہ آپ کی طرح میں بھی ان کہانیوں کو زندہ سمجھتا ہوں اور زندہ کا پوسٹ مارٹم نہیں ہو سکتا تو پھر سوال یہ ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں؟ تو آپ ہی کے جملے کا سہارا لوں گا "اگر یہاں پوسٹ مارٹم کی ترکیب درست نہیں ہے تو اسے عمل جراحی کہہ لیجئے۔" میں آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ دراصل عمل جراحی ہی ہے اور جراحی صرف زندہ کی ہوتی ہے، جس کے زندہ رہنے کا امکان ہوتا ہے دراصل سرجن اسی کی سرجری کرتا ہے۔ اور اگر ناسور جان لیوا ہو جائے تو کسی بھی قسم کی سرجری نہیں ہوتی۔ اس سے یہ حقیقت تو واضح ہو گئی کہ عمل جراحی ایک مثبت پہلو ہے گرچہ یہ ہے بہت ہی تکلیف دہ لیکن زندگی نکھارنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے اور اگر اس سے اجتناب کیا جائے تو پھر زخم اندر ہی اندر ناسور بن جاتا ہے اور موت کا باعث ہوتا ہے۔ پھر تو پوسٹ مارٹم کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔

میری تنقید "کھری" ہے یا "پر تشدد" میں اس پر بحث نہیں کروں گا۔ ہاں لوگوں کو "پڑھنے میں مزہ دیتی ہے۔" اس کی جانکاری مجھے ہے۔ میں نے قبل بھی کہا تھا کہ میرا فرمایا ہوا حرف آخر نہیں ہے۔ ادب

میں حرف آخر کچھ نہیں ہوتا۔ جو ابھی "ہے" وہ کل "نہیں" ہو جائے گا۔ ہر لمحہ تغیر جاری رہتا ہے۔ مزاج، تیور اور زاویے بدلتے رہتے ہیں —— اور یہ تغیر متن کے ساتھ نہ ہو کر زیادہ تر تنقید کے ساتھ ہوتا ہے۔

میں نے کہانیوں کے تجزیے کا سلسلہ اپنے دوستوں اور کہانی کے بڑے اہم اور معتبر نام سے شروع کیا۔ یہ سب کے سب میرے ہم عصر بھی رہے ہیں۔ میں ان کے شانہ بہ شانہ چلنے کا دعوی نہیں کر سکتا، ہاں ان کی ہم عصری سے ہی خوش ہو لیتا ہوں۔ اپنے ہم عصروں پر قلم اٹھانا، کائی بھری پھسلن پر قدم جمائے رہنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی چوک سے بھی منہ کے بل گرنے کا امکان رہتا ہے۔

فکشن کی تنقید ہر زمانے میں ہوئی ہے اب بھی ہو رہی ہے لیکن اس میں مروت کو بہت دخل رہا ہے۔ بالکل کھری اور سچی بات کہہ دینا کسی مجاہدانہ فعل سے کم نہیں ہے۔ اور اس کام کیلئے اندر کی ایمانداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کا رواج بھی ہر دور میں رہا ہے، لیکن قاری کیچڑ اور حلوے میں تمیز کرنا جانتے ہیں۔ میں نے تجزیے کا یہ سلسلہ اپنے دوستوں سے اسلئے شروع کیا کہ بعد میں دوسروں کو یہ گمان نہ گزرے کہ میں اپنے دشمنوں پر اپنے دل کا غبار نکال رہا ہوں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے دوستوں نے نہ صرف اسے سراہابلکہ میری ہمت افزائی بھی کی۔ یقین جانئے میں اگر ان کی جگہ ہوتا تو شاید ہی اس "بے جگری" کا ثبوت دے پاتا۔

مشتاق احمد نوری، پٹنہ

☆فون پر تفصیلی گفتگو ہوتی رہتی ہے اس لئے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ریڈیو والے آواز پر جان دیتے ہیں:

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

ویسے کچھ چیزیں دیکھنے کی بھی ہوتی ہیں بلکہ صرف دیکھنے کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ پھر یہ بھی کہ ان آنکھوں سے کیا کچھ دیکھا جائے۔ کسی کا شعر ہے:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

"مباحثہ" کا تازہ شمارہ ملا۔ آپکی محبت کا قائل ہی نہیں بلکہ قتیل بھی ہوں۔ بیٹے کی شادی کر کے لوٹا ہوں۔ ابھی صرف صدیق مجیبی کی حمد، سلطان اختر کی رباعیوں، نظام صدیقی اور جمال اویسی کے مضامین نے ہی دامن دل کو اپنی طرف کھینچا ہے۔ خالد عبادی کی بیس غزلیں شامل ہیں۔ میرے خیال سے ایک ساتھ دس بارہ اور بیس غزلیں قاری کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتی ہیں۔ ایک شمارے میں ایک یا دو غزلیں ہی شائع ہونی چاہئیں تاکہ ہر شعر اپنا نقش چھوڑ سکے۔ عام طور پر قاری ایک دو غزلیں دیکھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ زیادہ غزلیں مجموعہ کلام کی زینت ہوں تو بہتر ہے۔

شمیم فاروقی، سہسرام

☆ ''مباحثہ'' کا شمارہ نمبر ۸ موصول ہوا۔ شکریہ۔ اس رسالے میں پڑھنے کی خاصی چیزیں ہوتی ہیں مگر دو دن میں میں نے تقریباً پڑھ لیں۔ سریندر پرکاش پر شوکت حیات کا مضمون اور انتظار حسین پر شافع قدوائی کا مضمون بہت ہی پسند آیا۔ علی امام کا افسانہ ''سانس لیتی ہوائیں'' بھی مزاوے گیا۔ جہاں تک شعری باب کا سوال ہے تو مظفر حنفی اور نامی انصاری کے علاوہ خالد عبادی کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ مشتاق احمد نوری کا ''سنگھاردان'' پر تبصرہ ہے۔ کسی سنجیدہ کہانی پر غیر سنجیدہ تجزیہ کیسے کیا جا سکتا ہے اس کی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کی Craft اور Content کے حوالے سے پروفیسر ڈاکٹر قمر جہاں کی جو سطور فاضل تجزیہ نگار نے نقل کی ہیں اگر وہ نام کے ساتھ پروفیسر ڈاکٹر نہ لکھتے تو ان سطور کو کسی حد تک مضحکہ خیزی سے بچایا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے یہ سطور انہوں نے سند کے طور پر پیش کی ہیں، تو بات وہیں سے شروع کرتا ہوں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اسلوب افسانوی ہو۔ ازراہ مذاق بھی اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو ہر زبان کے کتنے بڑے بڑے فکشن نگار منہ کے بل گریں گے۔ یہ قارئین کرام خود طے کر لیں گے۔ دوسری شرط کہانی میں کہانویت ہو۔ یعنی عورت میں عورت پن ہونا بہت ضروری ہے۔ تیسری شرط تو مضحکہ خیزی کی بھی تمام حدیں پار کر جاتی ہے۔ کہانی کے باطن میں کوئی نکتہ خواہ اخلاقی، سماجی، نفسیاتی، فلسفیانہ، عالمانہ یا کچھ اور ضرور پوشیدہ ہو۔ اس جملے کے بعد ہنسی کیسے روکی جا سکتی ہے، میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا۔ جو تجزیہ نگار اتنے سطحی پیمانے کو بنیاد بنا کر کسی فن پارے کا تجزیہ کرے گا تو وہ کتنا معتبر ہوگا اسکی وضاحت کی تو ضرورت نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مشتاق صاحب نے افسانہ بہت گہرائی اور گیرائی سے پڑھا ہے لیکن اتنی توجہ سے اپنی تحریر بھی پڑھ لیتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ صفحہ ۸۶ پر وہ خود لکھتے ہیں جب کسی فرد کو اسکے خاندانی ورثے سے ہی محروم کر دیا جائے تو پھر وہ زندہ کس کے سہارے رہے گا؟ اس کہانی کا سب سے اہم اور خوبصورت نکتہ یہی ہے جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ آگے کے صفحات پر وہ اپنی ہی رائے کو رد کرتے ہیں۔ تفریح کا سامان یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ افسانے کے اختتام پر جب تک چونک کر اچھل نہ پڑیں، اچھا افسانہ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ جو عورتیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں انکے بلاؤز کے بٹن / ہک آگے ہوتے ہیں ورنہ عام گھروں میں یہ پیچھے ہوتا ہے۔ زبان کی غلطیوں کو میں اس لئے نظر انداز کر رہا ہوں کہ وہ کاتب کے سر بھی ڈالی جا سکتی ہیں، ہر چند کہ ایسا نہیں ہے۔ بھئی بڑی معلومات ہے مشتاق صاحب کو۔ جو عورتیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں وہ خاص گھر ہیں اور جو نہیں پلاتیں وہ عام گھر ہیں۔ جو آدی واسی عورتیں بلاؤز پہنتی ہی نہیں وہ کس گھر میں رکھی جائیں گی۔ یا Elite طبقے کی وہ عورتیں جو دودھ بھی نہیں پلاتیں اور ہٹ دھرمی کا عالم یہ ہے کہ بٹن / ہک بھی آگے کر لیتی

ہیں اور تو اور ساڑی بھی ناف سے اتنے نیچے باندھتی ہیں جہاں سے دراصل عورت شروع ہوتی ہے۔ اس پر بھی کچھ روشنی ڈالتے۔ بلاؤز کے کتنے بٹن ٹوٹیں گے اور ساڑی پیروں سے کتنے اوپر تک سرکے گی یہ تو نسیم جان کی کمر پر سو پچاس لات مار کر دیکھئے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تجزیے کا یہ کون سا معیار ہے۔ جو آدمی فساد میں لوٹنے نکلا ہو اس کی نفسیات اور قماش آپ نہیں جان پاتے۔ رنڈیوں کی وراثت میں برجموہن کا حصہ کیسے مل گیا؟ آخر تک آتے آتے صرف یہ ایک سوال بچا رہ جاتا ہے۔

حیرت ہے کہ آج کی اخلاقی قدروں کی پامالی کن منزلوں میں ہے اور آپ چکلے میں یہ سوال اٹھائے پھر رہے ہیں کہ فلاں کا ورثہ فلاں کو کیسے مل گیا۔ جس عہد میں لڑکی باپ، داداؤں کے حمل اسقاط کرا رہی ہو اس عہد میں قحبہ خانے میں حقوق العباد مشتاق صاحب ہی تلاش کر سکتے ہیں۔

ادب میں کمزور فن پارہ وقتی طور پر تو مقبول ہو سکتا ہے دائمی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے سنگھار دان کمزور افسانہ ہو لیکن یہ تو وقت بعد میں طے کرے گا، فی الحال تو اسے بہت پسند کیا گیا، Stage بھی ہوا، اہم اور بڑے لوگوں نے مثبت رائے دی ہے۔ ایسے کسی فن پارے پر نشانہ سادھنے سے پہلے تیر کمان کی جانچ پڑتال تو کر ہی لینی چاہئے۔

شاہد اختر، کان پور

☆ ''مباحثہ'' کا آٹھواں شمارہ اپنی مثال آپ ہے۔ نظام صدیقی کا مضمون 'معاصر غزل، نئے تنقیدی تناظر' بہت ہی جامع ہے۔ انہوں نے بہت ہی تفصیل سے معاصر غزل کا جائزہ پیش کیا ہے۔ قدوس جاوید کا مضمون بہت ہی محنت سے لکھا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی بات مدلل پیش کی ہے جس سے اپنا عندیہ خاص طور پر قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔

سب سے مزیدار تو ''سنگھار دان'' کا تجزیہ ہے۔ اس کہانی نے جتنی اونچائی تک شہرت پائی مشتاق نوری نے اتنی ہی بے دردی سے اسے چور کر کے رکھ دیا۔ لیکن ایک بات ہے کہ نوری بے ایمانی نہیں کرتے۔ جو تعریفی پہلو ہے اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور تنقید کے ایسے ایسے گوشے تلاش کرتے ہیں جہاں تک عام قاری کی پہنچ نہیں ہو پاتی۔ آپ ان کے تجزئے سے لاکھ اختلاف کریں وہ اپنی بات قاری سے تو منوا ہی لیتے ہیں۔

شموئل احمد کی مہاماری میں حقیقت کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہے۔ آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ کہیں کہیں یہ رپورتاژ جیسا ہو جاتا ہے۔ ایسے یہ دلچسپ ضرور ہے۔ رؤف خیر کی نظم ''مظلوم ماں کا عزم مصمم'' مجھے خاص طور پر پسند آئی۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔ آپ کے نام کی طرح آپ کا رسالہ بھی قد آور ہوتا جا رہا ہے۔

زرتاج **سلطانہ، علیگڑھ**

☆☆

MOBAHASA Vol -1- No.9 Dec- Jan. 2003

Nezam Manzil, Annie Besant Road, Patna- 800 004

Printed at Sunrise Plastic Works ,Opp. Science College, Patna-800006